کاروانِ وطن

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخ دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار دہلی ۶

شاخ بمبئی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسیس بلڈنگ جے جے ہسپتال بمبئی ۳

طبع اول سنہ ۱۹۶۰ء

۱۰۰۰

قیمت سات روپے پچاس نئے پیسے

یونین پرنٹنگ پریس دہلی

انتساب
فخرِ وطن، نازشِ علم و ادب
حضرۃ مولینا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور
کے نام

فہرستِ مضامین

منزل

"کاروانِ وطن" والدِ محترم کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل اُن کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محرومؔ"۔ "گنجِ معانی" پہلی بار ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شائع ہوئی، اور دوسری بار ۱۹۵۷ء میں دہلی سے۔ اسی طرح "رباعیاتِ محرومؔ" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اضافے کے بعد ۱۹۵۴ء میں دہلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ "گنجِ معانی" میں صرف نظمیں شامل ہیں۔ اور "رباعیاتِ محرومؔ" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے رباعیات پر مشتمل ہے۔

اگرچہ "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محرومؔ" سے قبل والد کے کلام کے کچھ اور مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں، مثلاً کلامِ محرومؔ حصّہ اوّل (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۲۱ء) کلامِ محرومؔ حصّہ دوم (۱۹۲۰ء) کلامِ محرومؔ حصّہ سوم (۱۹۲۳ء) وغیرہم۔ لیکن ان مجموعوں کو اب اُن کی تصنیفات

کی فہرست میں شامل نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ یہ مجموعے کسی نہ کسی صورت میں بعد کی تصنیفات میں شامل کر دیے گئے۔ مثلاً کلامِ محروم حصۂ اوّل جو ادبی اور نیچرل نظموں پر مشتمل تھا سارے کا سارا "گنجِ معانی" میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح کلامِ محروم حصۂ دوم آپ کے سیاسی کلام پر مشتمل تھا۔ اس مجموعے کی نظمیں زیرِ نظر تصنیف میں شامل ہیں۔ کلامِ محروم حصۂ سوم کا موضوع حسن و عشق تھا۔ اس حصّے کی بعض نظمیں "گنجِ معانی" کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کی گئی تھیں۔ لیکن اب ارادہ یہ ہے کہ جب "گنجِ معانی" کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو تو اس عاشقانہ کلام کو اس میں سے نکال کر ایک الگ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔

زیرِ نظر کتاب "کاروانِ وطن" سیاسی منظومات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی سیاست وطن اور جذبۂ حبِ وطن کے گرد گھومتی ہے۔ یہی ان نظموں کا مرکزی خیال ہے۔ اس مجموعے کے دو حصّے ہیں، "فریادِ جرس" اور "منزل"۔ "فریادِ جرس" ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک یعنی دورِ غلامی کی نظموں پر مشتمل ہے۔ اور "منزل" میں ۱۹۴۷ء کے بعد یعنی آزادی کے زمانے کی نظمیں شامل ہیں۔

"کاروانِ وطن" کی نظموں سے ظاہر ہے کہ والد نے سیاسی موضوع پر بہت لکھا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جہاں کہیں بھی اُردو کی سیاسی شاعری کا ذکر آیا ہے والد کا نام اس سلسلے میں بہت زیادہ سامنے نہیں آیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ والد کا بیشتر سیاسی کلام ملک کے جرائد میں بغیر نام کے شائع ہوتا رہا ہے۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں نیم سرکاری قسم کی ملازمت میں رہ کر اپنے نام سے سیاسی نظمیں شائع کرانا ایک ناممکن امر تھا۔ اس لئے والد کی شاعری کا یہ پہلو نقادوں اور اُردو کے دوسرے طالب علموں کی نظر سے قریب قریب پوشیدہ رہا۔ جہاں تک مجھے علم ہے

اُن کی سیاسی شاعری کے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اُس مقالے کے علاوہ جو "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوا ہے، اور "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر (جلد دوم) کے اُس مقالے میں جو راقم نے ان کے متعلق لکھا ہے اور جس میں والد کی سیاسی شاعری کا ہلکا سا ذکر موجود ہے اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

والد کی شاعری کی ابتدا بیسویں صدی کے شروع میں ہوئی، اور اُسی وقت سے سیاسی موضوعات پر بھی آپ برابر لکھتے چلے آرہے ہیں۔ "بھارت ماتا کیوں روتی ہے"۔ "لٹل جون" اور بہادر شاہ ظفر کے مصرعے "اسیر و کر و کچھ رہائی کی باتیں" کی تضمین اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ملازمت کی ابتدا کی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں اگرچہ اس وقت ایک پس ماندہ علاقہ تھا لیکن آزادی کی تحریک یہاں بھی ہندوستان کے دوسرے دور افتادہ علاقوں کی طرح موجود تھی۔ مشہور قومی کارکن اور رہنما دیوان بھجوں رام گاندھی یہیں[1] کے باشندے ہیں۔ اُس زمانے میں اُن کا قیام وہیں ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں تھا۔ والد سے اُن کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ تو سیاسی کارکن تھے۔ اس لیے حکومت کی نظرِ عتاب سے بچ نہیں سکتے تھے۔ اُن کی وجہ سے والد پر بھی سی، آئی، ڈی کی نگرانی شروع ہوگئی۔ یہ نگرانی ایک زمانے تک رہی اور اس ساری مدت میں والد کا سیاسی کلام رسائل و جرائد میں بغیر نام کے چھپتا رہا۔

---

[1] دیوان بھجوں رام گاندھی شمال مغربی صوبہ سرحد میں خان عبد الغفار خاں کے دستِ راست تھے۔ اور اس صوبے میں آپ نے تحریکِ آزادی کو ہوا دینے میں بڑا کام کیا۔ ۱۹۳۷ء میں جب ملک میں کانگریس نے اپنی وزارتیں بنائیں تو آپ ڈاکٹر خان صاحب مرحوم کی کابینہ میں پہلے وزیرِ مالیات کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریسی وزرا گاندھی جی کی ہدایت کے مطابق پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں جب آپ کلور کوٹ (ضلع میانوالی) میں تھے تو یہ راز کسی طرح کھل گیا۔ میانوالی کی پولیس نے والد کے خلاف ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ کردی۔ آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں پولیس کی فائل میں موجود تھیں کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود معاملے نے بہت طول نہ کھینچا، کیونکہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی سرکاری طور پر رائے کچھ بھی تھی، وہ ان نظموں کی بنا پر والد کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ اس مواخذے میں آپ بری ہوگئے لیکن ان کی سیاسی شاعری پر اس کا یہ اثر ہوا کہ آپ نے نظمیں رسائل وغیرہ کو بھیجنا بند کردیا، کیونکہ ڈاک پر سنسر کا اندیشہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ چنانچہ اکثر و بیشتر نظمیں اس وقت تک غیر مطبوعہ ہیں۔ "زندانیوں کی عید"۔ "حسرت موہانی"۔ "ہری کشن کے پھول"۔ "دیکھ اے ہلالِ شام"۔ "ایک دوست کے قید ہو جانے پر"۔ "ہندی نوجوان سے" اسی زمانے کی نظمیں ہیں، اور اس دور میں ان نظموں کا اشاعت پذیر ہونا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ جوش ملیح آبادی نے شاید ایسے ہی موقعوں کے متعلق کہا ہے ؎

افسوس بے شمار سخنہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

آج ہندوستان آزاد ہے، اور ان نظموں سے خوفِ فسادِ خلق کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، چنانچہ یہ نظمیں جن کا موضوع وطن اور حُبِ وطن ہے، "کاروانِ وطن" کے نام سے منظرِ عام پر لائی جارہی ہیں۔ امید یہی ہے کہ اہلِ ہند و پاکستان اس کتاب کا اسی طرح خیر مقدم کریں گے جس طرح انھوں نے والد کی دوسری تصانیف "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محروم" کا کیا ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ اُن کا باقی غیر مطبوعہ کلام جو ترتیب دیا جا چکا ہے، تین مختلف مجموعوں کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ ان مجوزہ تصانیف کی تفصیل یہ ہے۔

نیرنگِ معانی	ادبی اور نیچرل موضوعات پر نظمیں
شعلۂ نوا	غـــزلیں
بہارِ طفلی	بچّوں کی نظمیں

زیرِ نظر مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں جن کرم فرماؤں اور دوستوں نے خاص طور سے امداد فرمائی ہے اُن کا میں تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ ڈاکٹر عابد حسین، خان بہادر ظفر حسین خاں، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محی الدّین قادری زور، اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا اس موقع پر ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی، میں ان کا سپاس گزار ہوں، اگر ان حضرات کی امداد شاملِ حال نہ ہوتی تو اس مجموعے کی اشاعت میں بہت تعویق ہوتی۔

موتی باغ
نئی دہلی
۱۰ ستمبر ۱۹۵۸ء

جگن ناتھ آزاد

جب مجھ سے کسی شاعر کے کلام پر اظہارِ خیال کی فرمائش کی جاتی ہے، تو سب سے پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر مجھ سے عمر میں بڑا ہے یا چھوٹا ـــــ اگر بڑا ہوتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے غالباً اُس کے کلام پر رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں، اور اگر چھوٹا ہوتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں، کیونکہ اس طرح اپنی بزرگی ـــ نہیں محض طوالتِ عمر ـــ سے فائدہ اُٹھانے کو میرا جی چاہتا ہے اور خیال کرتا ہوں کہ جس طرح میں اپنے بڑوں کا احترام کرتا ہوں، وہ بھی اسی طرح میرا احترام کرے گا اور جو کچھ میں کہتا ہوں ـــــ خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو ـــــ اُسے اگر وہ مان نہیں لے گا تو کم از کم اس کی تردید میں گستاخی سے بھی کام نہیں لے گا، حالانکہ اِس زمانہ میں جب کہ

دشنام حلال است و شکر خندہ حرام است

اس اخلاق کی توقع کسی کی طرف سے قائم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جس وقت جگن ناتھ آزاد نے (صاحب کا اضافہ اُن کے نام کے ساتھ مجھے پسند نہیں، کیونکہ اُن کو چھوٹا سمجھنے اور چھوٹوں ہی کی طرح اُن سے خطاب کرنے میں مجھے زیادہ لطف آتا ہے) مجھ سے اپنے والدِ محترم جناب محرومؔ کے مجموعۂ کلام "کاروانِ وطن" پر اظہارِ خیال کی درخواست کی تو مجھے قدرے تامل ہوا، کیونکہ میں سمجھتا تھا وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہوں گے، اور اُن کی بزرگی کے پیشِ نظر صاف صاف کہنا میرے لئے غالباً مشکل ہوگا، لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹے ہیں تو میرا یہ پس و پیش دُور ہو گیا، لیکن نہایت قلیل عرصے کے لئے، بالکل عارضی طور پر، کیونکہ اس کے بعد جب میں نے اُن کے کلام پر نگاہ ڈالی تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور بزرگی و زُرگی کا سارا ڈھکوسلا ختم ہو گیا۔ میں اِس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود، ذہن و فکر کے لحاظ سے وہ مجھ سے بہت بڑے نکلیں گے

اتنے بڑے۔ کہ اُن کی بالکل ابتدائی نظموں کے سمجھنے کے لئے بھی مجھے ایک قرن پہلے یا ایک قرن بعد پیدا ہونا چاہیئے تھا۔

پھر اگر اُن کے منظومات صرف غزلوں یا منظری نظموں تک محدود ہوتے تو شاید میں اس قدر مرعوب نہ ہوتا، لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ ۱۹۰۶ء میں بھی (جب کہ اُن کی عمر ۱۹ سال کی تھی اور میری ۱۲ سال کی) وہ اپنی ایک وطنی نظم میں اتنی اونچی بات سوچ سکتے تھے کہ

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے!

تو میں اپنے اندر بڑا احساسِ کمتری پاتا ہوں، کیونکہ اُس وقت کیا، اس وقت بھی یہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکتی کہ کوئی نوجوان شاعر حُسن و عشق کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی سکتا ہے اور محض سوچتا ہی نہیں بلکہ حد درجہ خلوص و صداقت کے ساتھ کہہ بھی سکتا ہے۔ اچھا ہوا کہ ان کی اس نوع کے منظومات میری نظر سے نہیں گزرے، ورنہ میں یقیناً اُن کو سخت قابلِ رحم سمجھتا، اور اُن کی زندگی کو لائقِ افسوس!

میری اُن کی ذہنیت میں اتنا فرق کیوں تھا؟ اس کا سبب اُس وقت تو میں کچھ ہی نہ سکتا تھا، لیکن اب میری سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ کہ میں مُسلم گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور وہ ہندو گھرانے میں ــــ میں مذہب کی روایتی تعلیم سے حد درجہ متاثر تھا اور ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ معلوم نہیں کس وقت کافر کہہ کر شہر بدر کر دیا جاؤں، اس لئے جب میں اس گھُٹی ہوئی فضا سے کچھ دیر کے لئے علیحدہ ہو جاتا تو حُسن و عشق ہی کی باتوں سے اس زنگ کو دُور کرتا ــــ برخلاف اس کے جنابِ محرومؔ کی تعلیم و تربیت ہندو گھرانے میں ہوئی، اور چونکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ محض ایک عمرانی نظام ہے جس کی عدم پابندی پر کوئی ہندو، کافر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جناب محرومؔ جو بات اب سے ۵۰ سال پہلے سوچ سکتے تھے، میں شاید آئندہ پچاس سال کے بعد بھی اتنی صداقت کے ساتھ نہ سوچ سکوں گا۔ یہی فرق تھا میرے ان کے ماحول کا، کہ جب دورانِ تعلیم یا عنفوانِ شباب ہی میں شاعری شروع کی تو اُن کے ہاتھ میں دامنِ وطن تھا اور میرے ہاتھ میں دامنِ حُسن و عشق، یعنی ٹھیک اس زمانہ میں جب وہ مظلومیتِ وطن کی داستان سُناتے ہوئے یہ دُعا مانگتے تھے کہ

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کردے!

تو میں صرف اس تمنا پر جان دیتا تھا۔

میں ہوں گا، رات ہوگی، وہ مہ جمال ہوگا
ساعت وہ آئے تو، جب جینا محال ہوگا

کتنا فرق تھا میرے اُن کے احساس میں! اور بلحاظِ فکر و نظر میں اُن سے کتنا فروتر تھا اور وہ چھوٹے ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کتنے بڑے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مخزن کا زمانہ عروج پر تھا۔ آزاد و حالی کی قائم کی ہوئی شاہراہ پر متعدد شعرا چل پڑے تھے، جن میں سے ایک محروم بھی تھے۔

اکبر کے طنزیاتی تنبیہات، اقبال کے مفکرانہ نصائح، اسمٰعیل میرٹھی کی سنجیدہ حقیقت نگاری اور سرور کے ادیبانہ مطالعۂ فطرت سے اس وقت کی فضائے شاعری گونج رہی تھی، اور انھیں آوازوں میں ایک آواز محروم کی بھی تھی، لیکن ان سے ذرا مختلف۔ اس میں نہ اقبال کے فلسفے کی گونج تھی، نہ اکبر کے طنزیاتی نشتر کی سرتیزی، نہ اسمٰعیل و سرور کی سی مادی یا تنزیہی نقاشی بلکہ ایک مجروح احساس کی سی درد انگیزی، ایک اجتماعی درد و غم کی سی کسک اور ایک ٹھہرا ہوا شعور۔ مداوا جو صلائے جنون و گریباں چاکی نہ تھا بلکہ ایک نوع کی دعوتِ بخیہ گری تھی۔

پھر یہ تو نہیں کہ میں نے آوازوں کی طرف سے کان بند کرلئے ہوں۔ میں بھی اس شور کو سنتا تھا، چونک چونک پڑتا تھا لیکن اِس کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ کہ

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم

ہر چند کچھ زمانے کے بعد میں بھی چونکا اور ۱۵ء سے میری قومی نظمیں بھی زمیندار اور الہلال میں شائع ہونے لگیں، لیکن میری یہ بیداری بھی خوب ہی سی تھی، کیونکہ جو کچھ میں سوچتا اور کہتا تھا اس کا تعلق زیادہ تر بیرونی سیاستِ اسلامیہ سے تھا اور وطن پرستی کا کوئی جذبہ میرے اندر پیدا نہ ہوا تھا ـــــ اس لئے میری اُن کی ذہنیت کے اِس عظیم فرق کو دیکھ کر آپ بآسانی اندازہ کرسکتا ہے کہ بہ لحاظ فکر و نظر وہ مجھ سے کتنے بڑے ہیں اور اُن کے ملی و وطنی شعور کی تحقیق و داد دینے کی صلاحیت مجھ میں کتنی کم پائی جاتی ہے۔

اگر جناب محروم کی تمام شاعرانہ تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ پورے ایک قرن کی تاریخ ادب کو سامنے رکھ کر اُن کے نقوشِ فکر کا مرتبہ متعین کیا جائے، اور یہ کام آسان نہیں۔ کیونکہ اس سلسلے میں یہ سوال ہمارے سامنے نہیں آتا کہ اس وقت تک اُنھوں نے کیا کیا لکھا بلکہ یہ کہ انھوں نے کیا نہیں لکھا۔

یوں تو بہ لحاظِ اصنافِ سخن ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے غزلیں بھی لکھیں، نظمیں بھی لکھیں، قطعے اور رُباعیاں بھی لکھیں، لیکن یہ بات اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ہم کو یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ ان تمام منازل سے کیوں کر گزرے۔ کن خصوصیات کو لئے ہوئے گزرے اور اپنی انفرادیت کے کیا کیا نقوش چھوڑتے ہوئے گزرے، لیکن مجھے اس وقت اُن کی شاعری کے ان تمام وسیع حدود کو نہیں دیکھنا، بلکہ صرف ان نظموں کو دیکھنا ہے جن کا موضوع صرف "وطن وحُبِّ وطن" ہے، جو میری رائے میں اُن کی تمام کارگاہِ شاعری کا Nucleus ہے، اور اسی کے چاروں طرف اُن کے دوسرے اصنافِ سخن بھی گردش کرتے ہیں۔

شاعروں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو خود قصد کر کے شعر تک پہنچتے ہیں، دوسرے وہ جن تک شعر خود پہنچتا ہے۔ اُس کا جذبہ وخیال صرف شعر ہی کی صورت میں ہم کو اپیل کر سکتا ہے اور اس کے فکر و احساس کی بلندی وپاکیزگی (شاعری سے قطعِ نظر) بجائے خود اتنی دلچسپ ہوتی ہے کہ شعر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

عربی میں علیٰ قدرِ مراتب شاعر کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں، شعرور، شُوَیعر، مُتشاعر، شاعر اور خنذیذ۔ اوّل الذکر دو قسمیں وہ ہیں جن کا تعلق شاعری سے نہیں بلکہ اتہامِ شاعری سے ہے۔ متشاعر وہ جس کو دوسرے الفاظ میں شعر فروش یا محض ردیف و قافیہ کا شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد حقیقی شاعری کے حدود شروع ہوتے ہیں، جس میں شعورِ انسانی بھی شامل ہوتا ہے اور فنی خوبی کے ساتھ حُسنِ فکر بھی پایا جاتا ہے، اور اسی کی انتہائی ارتقائی منزل وہ ہے جب ایک شاعر خنذیذ یا نابغہ ہو جاتا ہے۔

بہرحال اِس میں شک نہیں کہ شعر محض فنی تار و پود کا نام نہیں بلکہ اس کا حقیقی تعلق فکر و خیال سے ہے اور انھیں دونوں کے امتزاج سے مراتبِ شاعری کی تعیین ہوتی ہے۔

ادبیات میں دو چیزیں اور بھی قابلِ لحاظ ہیں، تفصیل و ایجاز اور شاعری میں ان دونوں کا صَرف بڑا سلیقہ چاہتا ہے، کیونکہ بسا اوقات ایک شاعر تفصیلی جزئیات کی کوشش میں اطناب تک پہونچ جاتا ہے، اور ایجاز کی سعی میں اہمال تک ـــــ پھر جب ہم ان تمام خصائص شاعری کو سامنے (جن میں فنّی شعور، فکر و خیال، اسلوبِ بیان، صداقت و حقیقت اور تفصیل و ایجاز سب کچھ شامل ہے) جناب محرومؔ کی شاعری پر غور کرتے ہیں تو اس میں یہ تمام باتیں بڑے اچھے توازن کے ساتھ ہم کو مل جاتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ موقع و محل کے لحاظ سے مناسب الفاظ کا استعمال جو بلاغت کی شرطِ اوّلین ہے کہ یہ محرومؔ کا خاص فن ہے۔ ملک میں جناب محرومؔ کی رباعیاں بہت مشہور ہوئیں۔ یہاں تک کہ رباعی کے ذکر میں محرومؔ کا نام اور محرومؔ کے ذکر میں رباعی کا تصوّر ناگزیری چیز ہے، اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ ایجاز گوئی میں انھیں بڑا سلیقہ حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے قطعات بھی اس خصوصیت سے خالی نہیں اور غزلوں میں بھی (حالانکہ وہ غزل گو شاعر نہیں ہیں) وہ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں۔

محرومؔ جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ شاعری کا بڑا عجیب و غریب دور تھا، ایک طرف روایتی شاعری گریباں گیر تھی، دوسری طرف آزادؔ و حالیؔ کی درایتی شاعری دامن گیر۔ ایک طرف نشاط از دست رفتہ کی یاد تھی، دوسری طرف اندیشۂ حال و مستقبل کی فریاد۔ ایک طرف داستان سرائی تھی، دوسری طرف حقیقت آرائی۔ ایک طرف "عشرتِ دیر غنودن" تھی، دوسری طرف "صلائے بیداری و راہ پیمودن" ایک طرف محفل عشرتِ شبانہ تھی، دوسری طرف نفیرِ زمانہ ـــــ کچھ لوگ ہنوز محوِ خواب تھے، کچھ چونک پڑے تھے، اور کچھ انگڑائیاں لے کر چل پڑنے والے بھی تھے ـــــ انھیں میں ایک محرومؔ بھی تھے، جنھوں نے جادۂ نو پر قدم رکھا، اور اس انداز سے گویا وہ پہلے کبھی گمراہ ہی نہ ہوئے تھے۔ جسے اگر ہم چاہیں تو اُن کی زندگی کا المیہ بھی کہہ سکتے ہیں، اگر فکری تقدّس کے لئے جذبات کی لذّتیت کی قربانی بھی ضروری قرار دی جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ عنفوان شباب ہی میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا محرومؔ کو کس نے سکھایا اور ان کی اس سلامت روی کے کیا اسباب تھے ـــــ مجھے اُن کے ماحول، اُن کی تربیت اور خاندانی روایات کا علم حاصل نہیں، ورنہ شاید میں سمجھ سکتا کہ قبل از وقت اُن کی ذہنی پختگی کے کیا اسباب تھے۔ وہ کونسا ذہنی اضطراب تھا جس نے انھیں اس قدر جلد

مصلحانہ سنجیدگی کی طرف مائل کر دیا اور وہ کون سی ناآسودگیاں تھیں جنھوں نے محرومؔ تخلص رکھنے پر انھیں مجبور کیا۔ کاش کے اِس سلسلے میں ہم کچھ اور بھی کہہ سکتے۔

جیسا کہ اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں، رُباعی نگاری، محرومؔ کا خاص رجحان تھا، جو شاعری میں فنّی و ذہنی استعداد کی بڑی کسوٹی سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اگر اس سلسلے میں یا اس سے پہلے ہی انھوں نے ملّی و وطنی شاعری کو اختیار کر لیا تو اُن کی فطری متانت، و افتادِ طبع کے لحاظ سے تو کوئی عجیب بات نہ تھی، لیکن اس پر شدید استقامت ضرور ایک حد تک تعجب انگیز ہے۔

اس وقت ان کی رباعیوں یا غزلوں پر اظہارِ خیال مقصود نہیں، بلکہ صرف وہی منظومات سامنے ہیں جو جذبۂ وطنیت سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کا مجموعہ "کاروانِ وطن" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

کلاسیکل اُردو شاعری میں وطنیت کا عنصر ہم کو بہت کم یا بالکل نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ عہدِ میرؔ و سوداؔ میں یا اس سے قبل خال خال کوئی ایسا شعر مل جائے جس کو ہم کھینچ تان کر جذبۂ وطنیت سے منسوب کر سکیں۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ "ملّت و وطن" ہمارے کلاسیکل شعراء کا موضوع کبھی نہیں رہا — غالباً اس لئے کہ اُردو غزل گوئی، فارسی غزل گوئی کا چربہ تھی اور ایرانیوں میں اُس وقت غزل نام تھا ایک خاص لب و لہجہ میں ذکرِ محبوب کا اور محافلِ مے و مینا کا، جو جذباتِ محبت کی آسودگی و ناآسودگی دونوں حالتوں میں بڑی محرک ثابت ہوتی ہیں۔ اُن کے امیال و عواطف، اُن کے شاعرانہ تعبیرات، اُن کے رموز اور سوچنے کے طریقے سب غیر وطنی تھے۔ اپنے ملک، اپنے ملک کی چیزوں سے دلچسپی لینے کا ذوق ان میں پیدا نہ ہوا تھا — یقیناً یہ بڑی افسوسناک بات تھی، لیکن یہ لازمی منطقی نتیجہ تھا، مسلم حکومتوں کے ماحول کا جو اپنے زوال کے بعد بھی مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر بڑا دیرپا اثر چھوڑ گئیں۔

کلاسیکل شعراء میں سب سے پہلا شاعر جس کو احساس کی اس گمراہی سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے، نظیرؔ اکبرآبادی تھا۔ اس کو بیشک اپنے وطن، اپنے وطن کی چیزوں، اپنے وطن کی روایات سے بڑی محبت تھی، اور جس طرح لہک لہک کر اُس نے ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑا وطن پرست شاعر تھا۔

اس کے بعد عرصے تک کوئی شاعر اس ذوق کا نہیں اُبھرا، یہاں تک کہ غالب کا دَور آگیا اور اُس وقت سب سے پہلے حالی نے وہ قدم اُٹھایا جسے اُردو شاعری میں وطنیت پرستی کی پہلی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔

ہر چند اس وقت ملک کے حالات کا اقتضا ریہی تھا کہ ذہنِ انسانی قدرتاً حسن عشق کی باتوں سے گزر کر کام کی باتوں کی طرف متوجّہ ہو۔ کیونکہ بقولِ غالب، عشرتِ ماضی کا تمام سوز و سرور اور جوش و خروش ختم ہو چکا تھا، اور شاہِ ظفر کے ساتھ صحبتِ شب کی آخری شمع بھی گُل ہو چکی تھی۔ غیر ملکی حکومت کے شدائد کافی عبرت انگیز حد تک پہنچ چکے تھے اور ان مصائب کا احساس سبھی کو تھا، لیکن معاشرہ کی اِس دُکھتی ہوئی رگ کو حالی کے سوا کوئی نہ پکڑ سکا۔ تاہم چونکہ حالی کی آواز وقت کی آواز تھی، حالِ مستقبل کی آواز تھی، اس لئے وہ بالکل بے اثر نہ رہی اور آخر کار اُس دَورِ شاعری کا آغاز ہو گیا جس نے اقبالؔ، اکبرؔ، اسمٰعیل میرٹھی، چکبستؔ اور محرومؔ ایسے شاعر پیدا کئے۔

ہر چند اِن سب کا نصب العین ایک ہی تھا، منزل ایک ہی تھی، لیکن راستے مختلف تھے، جن سے ہر ایک کی انفرادیت الگ الگ پہچانی جا سکتی ہے۔ اقبالؔ کی حیثیت ایک بلند بانگ نقیب کی سی تھی، اور اکبرؔ کی ایک نشترِ فصّاد کی سی۔ اسمٰعیل نے مطالعۂ حقائق پر زیادہ زور دیا، اور چکبست نے رجز خوانی پر۔ لیکن محرومؔ کا رنگ ان سب سے علیحدہ تھا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالی کا اثر سب سے زیادہ محرومؔ ہی نے قبول کیا۔ وہی سادگیِ بیان، وہی پُر خلوص لہجہ۔ وہی صداقتِ جذبات اور وہی سب کچھ جو ایک مخلص دوست کہہ سکتا ہے۔ ان کے یہاں نہ مجاہدانہ جوش و خروش ہے، نہ سرفروشانہ تبلیغ، لیکن صداقت اتنی زبردست پائی جاتی ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں۔

ان کے جذبات کا خلوص، اندازِ بیان کی متانت، گویا ایک ٹھہرا ہوا سمندر ہے جو طوفان سے زیادہ گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کی شاعری محض ماتمِ ملک و ملّت نہیں بلکہ مکمل داستان ہے، اُن کے دردمندانہ احساسات کی اور خود ان کے نفسیات و بطون کی جس کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔

یہ مجموعہ دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات و

واقعات سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصولِ آزادی کے بعد سے لے کر اس وقت تک کے تاثرات سے ـــــ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی تاریخ بھی ہے، جذباتی تصویر بھی، اور اس میں حسن سچّائی سے کام لیا گیا ہے، اُسے اگر

درائے شاعری چیزے دگر ہست

کہا جائے تو یقیناً غلط نہ ہوگا۔

آخر میں پھر ایک بار یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محرّوم کے بلند جذباتِ وطنیت کا صحیح اعتراف مجھ سے ممکن نہیں، تاہم اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اگر میں محرّوم کو اچھی طرح نہیں جان سکتا تو نہ جانوں

'باغ تو سارا جانے ہے'

نیاز فتحپوری

فریادِ جرس

دُعا

اے خداوندِ مہر، دُعا ہے تجھ سے

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثُریّا کر دے

رُوم و یوناں میں گئی روشنی جس مشعل کی

پھر اُسے نُور دہِ دیدۂ دنیا کر دے

ہم کو گر ہستیِ جاوید عطا کی تُو نے

اپنے الطاف پہ اک اور اضافہ کر دے

قعرِ پستی سے نکلنے کو ہیں بیتاب بہت

غیب سے خود کوئی سامان مہیّا کر دے

حالت اپنی ہے عیاں تجھ پہ، یہ کہنا ہے فضول
ہم کو اِس طرح بنا دے، ہمیں ایسا کر دے

داغِ اُلفت سے بہارِ چمنِ ہند بڑھے
دل کے ہر پھول کو ہم رنگِ ہزارا کر دے

یہی سینے تری توحید کے آئینے تھے
عکس سے اپنے انھیں پھر متجلا کر دے

رام و لچھمن کی جبیں میں جو کبھی روشن تھا
پھر اُسی نُور کے جلووں کو ہویدا کر دے

صَومعے رشیوں کے تاریک نظر آتے ہیں
پھر ہمالہ کی گپھاؤں میں اُجالا کر دے

بھارت ماتا کیوں روتی ہے؟

مضطرب کس لیئے یوں ہوتی ہے بھارت ماتا

روتی ہے، جانِ حزیں کھوتی ہے بھارت ماتا

داغِ افلاس کو یوں دھوتی ہے بھارت ماتا

دانۂ اشک پڑی بوتی ہے بھارت ماتا

تم کو معاوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

دل بلا سختیٔ ایّام کے سہنے کے لئے

جگرِ خوں شدہ ہے آنکھ سے بہنے کے لئے

دست و پاکس نے دیئے تھے اُسے گہنے کے لئے

کہ بنے زیورِ زنجیر میں رہنے کے لئے

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

نہ تسلی ہے کسی کی نہ دِلاسا، افسوس!

مرضِ غم کا نہیں کوئی مداوا، افسوس!

نہیں غم خوار کوئی اپنا پرایا، افسوس!

بیکسی دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجا، افسوس!

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

جس نے کی اس سے محبت وہ گرفتار ہوا

چارہ گر اس کا ہوا جو، وہی بیمار ہوا

آسماں اُس کے مٹانے کو جو تیار ہوا

بے طرح ہر کہ و مہ درپئے آزار ہوا

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

کب سے پامالِ جفا ہوتی چلی آتی ہے!

ہدفِ تیرِ بلا ہوتی چلی آتی ہے!

کشتۂ تیغِ قضا ہوتی چلی آتی ہے!

یونہی مظلوم سدا ہوتی چلی آتی ہے!

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

جس کی دولت سے ہوا ایک جہاں مالا مال

جس کے دریائے کرم سے کبھی دنیا تھی نہال

آج کل گردشِ افلاک سے ہو کر پامال

سامنے غیر کے پھیلاتی ہے دامانِ سوال

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

روز و شب چرخ پہ جب شمس و قمر آتے ہیں

اگلے نظارے نگاہوں کو نظر آتے ہیں

یادِ ایامِ کہن شام و سحر آتے ہیں

دن کہاں گزرے ہوئے بارِ دگر آتے ہیں

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

نہ رہی اپنوں میں کچھ بوئے محبت باقی

نہ پرایوں میں ہیں آثارِ مروت باقی

نہ ہے دولت، نہ ہے شوکت، نہ ہے عزت باقی

رہ گئی دہر میں اک خواری و ذلت باقی

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

سنہ ۱۹۰۶ء

لٹل جون

موسم بہار کا تھا، جوبن پہ گلستاں تھا

ہر تختۂ چمن پر فردوس کا گماں تھا

شاخیں لہک رہی تھیں، کلیاں چٹک رہی تھیں

اور بلبلیں گلوں پر ہر سو پھدک رہی تھیں

شاخوں پہ شاہدانِ گل مستِ رنگ و بو تھے

اور محوِ نغمہ سنجی مرغانِ خوش گلو تھے

شرمندہ سازِ گوہر تھی آب و تابِ شبنم

تارا سا تھا چمکتا ہر دُرِّ نابِ شبنم

پُر فتنہ، پُر ادا تھی انہار کی روانی

رفتارِ نہرِ جنّت ہو جس سے پانی پانی

صبحِ بہار خنداں خنداں چمن میں آئی

سبزے کے فرشِ مخمل کو کر دیا طلائی

شیدائے سیرِ گُل تھا محروم بھی اِدھر سے
جُزدان[1] بغل میں دابے نکلا چمن کو گھر سے
نزدیک آگئے تھے ایّامِ امتحاں کے
باقی تھی کچھ پڑھائی، لالے پڑے تھے جاں کے
ہم رنگِ نکہتِ گُل اُڑ کر چمن میں پہنچا
دل ہو گیا شگفتہ، گُل کے وطن میں پہنچا
ہر برگ و شاخِ گُل سے پیدا تھی شانِ قدرت
بے پردہ ہو رہا تھا رازِ نہانِ قدرت
داخل ہوئے چمن میں اُس دم فرنگی بچّے
آئیں پئے حفاظت آیائیں ساتھ اُن کے
وہ چھوٹے چھوٹے بچّے تھے سب گُلوں کے شیدا
گلشن کی ہر روِش پر پھرتے تھے بے تحاشا
آتا تھا جن کو چلنا وہ تو ٹہل رہے تھے
اور تھے جو ننّھے ننّھے، گھٹنوں پہ چل رہے تھے
چالاک تھا نہایت ان سب میں جو بڑا تھا
گو عمر میں بمشکل وہ پانچ سال کا تھا

[1] ایّامِ طالب علمی کی نظم ہے۔ (محروم)

پھولوں کی اس کے آگے نذریں گزارتے تھے
کہتے تھے جونؔ اُس کو جس دم پُکارتے تھے

جب توتلی زباں کو اپنی وہ کھولتا تھا
انگلش بھی بولتا تھا، اُردو بھی بولتا تھا

تھا پیڑ آنولے کا اک درمیاں چمن کے
اور ارد گرد اس کے پَودے تھے یاسمن کے

میں تھا کتاب پر واں سر کو جھکائے بیٹھا
تھا اس شجر کے نیچے ڈیرا لگائے بیٹھا

اور جونؔ اتفاقاً آکر ادھر سے گزرا
وہ پیارا پیارا بچّہ میری نظر سے گزرا

یہ کہہ کے میں نے اُس کو آہستہ سے پُکارا
اے جونؔ اس چمن میں کیا کام ہے تمھارا

جھٹ بول اٹھا کہ آئے ہم سیر کو یہاں ہیں
کیا پُر بہار دیکھو پھولوں کی کیاریاں ہیں

بچّے کی گفتگو جب مجھ کو پسند آئی
تقریر اس طرح کی کچھ اور بھی بڑھائی

پھولوں کے نام پوچھے، پودوں کے نام پوچھے

ایسے سوال اس سے میں نے تمام پوچھے

پچھتا رہا ہوں لیکن میں اک سوال کر کے

شرمندہ ہوں ابھی تک اس کا خیال کر کے

جلدی میں کہہ دیا یوں فخریہ میں نے اس سے

کیوں جون، ہیں نہ ہندی سارے جہاں سے اچھے

کچھ دیر کے لئے تو خاموش رہ گیا وہ

کیسی ہے یہ پہیلی، ننھا دل میں سوچتا وہ

غصے سے سرخ عارض کچھ اس کے تمتمائے

آنا رحبِ قومی آنکھوں سے پھر دکھائے

تیور بدل کے بولا یہ کیا کہا ادکا لے

اچھے نہیں ہیں ہرگز ہندوستان والے

انگریز ان سے اچھے سارے جہاں سے اچھے

ہندوستانی آئے بن کر کہاں سے اچھے

بچے کی بات کیا تھی، اک تیر تھا اثر میں

اس کی کماں سے نکلا، بیٹھا مرے جگر میں

اچھے نہیں ہیں بیشک ہندوستان والے
کہتے ہیں اُن کو ایسا سارے جہان والے
اچھے اگر یہ ہوتے، ہوتی انھیں خبر کچھ
سُود و زیاں پہ اپنے پڑتی کبھی نظر کچھ
اچھے اگر یہ ہوتے کچھ با فراغ ہوتے
ایجاد فن کے قابل اِن کے دماغ ہوتے
اچھے اگر یہ ہوتے رکھتے ملاپ باہم
ہرگز نہ وار کرتے اک دوسرے پہ پیہم
اچھے اگر یہ ہوتے آپس میں لڑ نہ مرتے
پستی سے کچھ اُبھرنے کی جد و جہد کرتے
محروم بے خطا ہے، گو کر گیا ملامت
اس ننھے جون کی ہے، گر ہے کوئی شرارت

سنہ ۱۹۰۶ء

بھارت ماتا

غم خوار ہے تُو، دل سوز ہے تُو، اے مونسِ جاں، بھارت ماتا
آغوشِ محبت ہے تیرا، دامانِ جناں، بھارت ماتا

دل کش، شاداب ترے میداں، یا سر بہ فلک ہیں کوہستاں
پستی و بلندی پر تیری شفقت یکساں، بھارت ماتا

یہ گنبدِ نیلی تھا اک دن تیری شوکت کا نقّارہ
تیری عظمت کے قائل ہیں ادوارِ زماں، بھارت ماتا

دے دے کے زمانہ رنج و الم، کیوں تجھ کو رُلاتا ہے پیہم
ہیں صورتِ اشکِ رواں تیرے دریائے رواں بھارت ماتا

ویرانے باغ ہُوئے تیرے جو پھول تھے داغ ہُوئے تیرے

گلزارِ مراد ہُوا تیرا تاراجِ خزاں بھارت ماتا

ہر چند ہے تو بیمار کہن، لیکن ہے قریب شِفا تیری

رہتا ہے بہ فکرِ چارہ گری خود اجمل خاں، بھارت ماتا

قائم ہے تاب و تواں تیری، صولت ہے سب پہ عیاں تیری

موجود ہیں جبکہ سپوت ترے نہرو سے جواں، بھارت ماتا

قدموں میں ترے آجائے گی، خود دَوڑ کے منزلِ آزادی

موجود جو رہبر راہِ عمل گاندھی ہے یہاں بھارت ماتا

دلبند ہزاروں ہیں تیرے، اس دَور میں جو مردانہ ہوئے

صدقے ہیں تری آزادی کے وقفِ زنداں، بھارت ماتا

چالیس کروڑ انسانوں میں پیدا کر جذبۂ خودداری

پھر دیکھ کہ کِن اَوجوں پہ ہے عزّت کا نشاں، بھارت ماتا

مائل بہ سخن جب ہوتے ہیں، ہم تیرے دُکھڑے روتے ہیں

قدرت نے دیا تیری خاطر یہ ذوقِ فغاں، بھارت ماتا

ہندوستانی نوجوان کی دُعا

دولت سے پیار دے، نہ غریبی سے عار دے

وہ چیز دے جو رُوح کو میری سنوار دے

تُو غیب سے مجھے دلِ خدمت گذار دے

وہ دل جو حوصلہ نہ مصیبت میں ہار دے

توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

بخشے اگر سعادتِ صدق و صفا مجھے

تب شُکر سے کہوں کہ جو چاہا، ملا مجھے

اپنے کرم سے کر وہ جوانی عطا مجھے

حاصل ہو جس سے خستہ دلوں کی دعا مجھے

توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

قوّت ہو بازوؤں میں کہ وہ کام کر سکوں
جس سے غریب ہند کی ہو آبرو فزوں
پیارا وطن ہو کیوں مرا دنیا میں سرنگوں
بزمِ زمانہ میں اسے برتر مقام دوں
توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

علم و عمل کی طلعتِ جاں بخش پاؤں میں
ہر کم نصیب ذرّے کو تارا بناؤں میں
دے مجھ کو وہ اُمنگ کہ کچھ کر دکھاؤں میں
در پیش بیکسی ہو تو گھبرا نہ جاؤں میں
توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

سینے میں ہو مرے دلِ بے کینہ، اے خُدا
ہر گرد سے ہو پاک یہ آئینہ، اے خُدا
خالی ہو ہر غرض سے مرا سینہ، اے خدا
دردِ وطن کا اس میں ہو گنجینہ، اے خُدا
توفیق مجھ کو اے مرے پروردگار دے!

غزل

سُدیشی تحریک

وطن کی اُلفت میں ہو زباں پر سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

سُنا، وہ ہندوستاں میں گھر گھر سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

یہیں کی رُوئی، یہیں کی ململ، یہیں کا ریشم، یہیں کی مخمل

نہ لنکا شائر، نہ مانچسٹر، سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

فضول جپ تپ ہے، یہ تو بتلا، ملے گا کیا تجھ کو اے برہمن

ثواب چاہے تو جاپ یہ کر: "سُدیش وستُو، سُدیش وستُو"

اِسی سے ہوگی نجات حاصل، سُنا ہی بزمِ وعظ میں تُو
کہ ہے جہاں میں ثوابِ اکبر، سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

ہوئے اسی خاک سے ہو پیدا، یہ سرزمیں ہے تمھاری ماتا
ہو یہ صدا اُن کے کیوں مکدّر، سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

نہ دل میں جس کے ہو کچھ حمیّت، وطن سے جس کو نہ ہو محبّت
سُنا دو بُزدل کو یہ کڑک کر، سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

ہے ملک اپنا غریب و بے زر، نہ ڈالو غیروں کا بوجھ اِس پر
کہو ہی با دلِ تونگر سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

ہے چُور زخموں سے اپنا بھارت، لگا دو تم مرہمِ محبّت
علاج اس سے نہیں ہے بہتر، سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

ہو دیکھ کر دل میں شاد و فرحاں کہ ہے رعایا کو دیش کا دھیان
سُنا دو جا کر حضورِ قیصر، سُدیش وستُو، سُدیش وستُو

سنہ ۱۹۰۶ء

جلوۂ اُمّید

گلشنِ ہندوستان میں پھر بہار آنے کو ہے
رنگِ نو سے لالہ و گُل پر نکھار آنے کو ہے

اَور بھی چل جم کے تُو اے صرصرِ آہِ سحر
ظلمتِ غم کی گھٹا میں انتشار آنے کو ہے

ہاں ذرا کچھ اَور بھی اُونچا ہو اے تیرِ دُعا
خود اجابت ہو چلی بے اختیار آنے کو ہے

سوزِ حبِّ قوم میں دل اَور بھی جل شمع ساں
کامیابی تجھ پہ اب پروانہ وار آنے کو ہے

اے سریندر ناتھ، اے مسٹر تلک اے گوکھلے
سُوئے عزّ و جاہ قومِ بے وقار آنے کو ہے

خونِ دل خونِ جگر سے سینچ کر جس نخل کو

تم نے پالا تھا اب اس میں برگ و بار آنے کو ہے

سعی و ہمت کے چلیں دو چار چپّو اور بھی

کشتیٔ طوفاں زدہ نزدِ کنار آنے کو ہے

ہے سرور انگیز کیسا بادۂ حُبّ وطن

ہاتھ میں ہے جام آنکھوں میں خمار آنے کو ہے

کس قدر ہستی فزا ہے جلوۂ صبحِ اُمید

نیّرِ اقبال تا نصف النّہار آنے کو ہے

مژدہ باد اے دیدۂ نظّارہ جُو منتظر رہیں

شاہدِ صنعت کے جوبن پر نکھار آنے کو ہے

اے جہالت دُور ہو، کافور ہو، ہٹ، بھاگ جا

علم کی دیوی کے سولہ سنگار آنے کو ہے

لے تعصب جا کہیں ماوا و ملجا ڈھونڈ لے

تجھ پہ آفت ہند میں اے نابکار آنے کو ہے

ہے کشاکش اس قدر آپس میں کیوں اے بیم و یاس

غیب کے پردے سے کچھ بروئے کار آنے کو ہے

ٹل گئی سر سے نحوست دن گئے افلاس کے
پھر فضائے دل میں ڈیرے آ لگے ہیں آس کے
ملک اپنا رشکِ صد گلستاں ہو جائے گا
اور صیادِ فلک خود باغباں ہو جائے گا
اک نگاہِ التفاتِ قیصرِ ذی جاہ سے
دیش یہ اُجڑا ہوا رشکِ جناں ہو جائے گا
ساحتِ ہندوستاں پر سایۂ شاہِ جہاں
ابرِ نیساں کی طرح گوہر فشاں ہو جائے گا
آسماں پر پرچمِ اقبال لہرائے گا پھر
پھر بلند اپنا زمانے میں نشاں ہو جائے گا
تازہ و سرسبز اپنی دیکھ کر کشتِ مُراد
چہرۂ بدبیں مثالِ زعفراں ہو جائے گا
اہلِ عالم نام پھر عزّت سے لیں گے ہند کا
پھر یہ بھارت باعثِ فخرِ جہاں ہو جائے گا
شرق میں اور غرب میں آکاش میں پاتال میں
چار سُو ہندوستاں ہندوستاں ہو جائے گا

تفرقے کو میٹ دے گا دستِ رسمِ اتحاد

اور ہر اک فرقہ یک دل یک زباں ہو جائے گا

جائیں گے سب اپنے بیگانوں کی محتاجی سے چھوٹ

دور دورہ جب سودیشی کا یہاں ہو جائے گا

کون پھر ہم کو کرے گا مردہ قوموں میں شمار

جب ہمارا دم قدم ہستی کی جاں ہو جائے گا

اپنی حرفت اپنا کام اپنی تجارت اپنا مال

ہر خرابہ پُر زگنجِ شائیگاں ہو جائے گا

کارداں ہوگا جب اپنا رہروِ راہِ عروج

آسماں پر خطِ جادہ کہکشاں ہو جائے گا

اے خنک وہ عہدِ فرخ جب مرا پیارا وطن

خوش نصیب و نیک بخت و کامراں ہو جائے گا

ملک ہو جائے گا ایسا قول ہے اپنا درست

"پھر غلط گا ہے چنیں گا ہے چناں ہو جائے گا"

آ بسے گی فارغ البالی ہمیشہ کو یہاں

اس چمن میں پھر نہ بھولے سے بھی آئے گی خزاں

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

تضمین مصرعہ ابوظفر بہادر شاہ ظفر

یہ مجبوری و بے نوائی کی باتیں ۔ یہ ناطاقتی، نارسائی کی باتیں
زمانے کی بے اعتنائی کی باتیں ۔ یہ ہیں سر بسر جگ ہنسائی کی باتیں

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

پر و بال اپنے اسیرو سنبھالو ۔ اٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ، پھندے سے گردن نکالو ۔ بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنالو

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

اگر دانے دانے پہ لڑتے رہو گے　　جو اک دوسرے سے بگڑتے رہو گے
قفس میں اگر تم اکڑتے رہو گے　　پڑے قید میں یونہی سڑتے رہو گے

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ صیاد ظالم ہے، نا مہرباں ہے　　محبت جو چاہو تو اس میں کہاں ہے
دل آزاریوں میں یہ اک آسماں ہے　　اذیت نئی، نت نیا امتحاں ہے

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

نہ سنگِ اسیری کو سینے پہ دھرنا　　جو مرنا تو صحنِ گلستاں میں مرنا
اگر کچھ حمیت ہے، یہ کام کرنا　　پھڑکنا، تڑپنا، اچھلنا، اُبھرنا

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ جھوٹے ہیں سب وعدہ ہائے رہائی　　نہ ان پر رکھو اپنی بخت آزمائی
اُڑی ہے گلستاں میں کل یہ ہوائی　　کہ صیاد نے اور قینچی منگائی

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

قفس میں تمھیں مدتیں کٹ چکی ہیں　　بہاریں کئی قید میں ہو گئی ہیں
چمن میں نئی آہ! کلیاں کھلی ہیں　　اُٹھو پھر کہ ایامِ وابستگی ہیں

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

پھر آئی ہے گلشن میں فصلِ بہاری　　شہِ گُل کی اُتری ہے آکر سواری
کہیں زلفِ سنبل نے اپنی سنواری　　کہیں چشمِ نرگس میں ہے بیقراری
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

چمن کیا ہے معشوقِ گل پیرہن ہے　　نرالی ہے سج دھج، انوکھی پھبن ہے
بنی شاخ شاخِ شجر اک دلہن ہے　　وہی دل رُبائی، وہی بانکپن ہے
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

مری بات سُن لو، اِدھر آؤ، دیکھو　　نہ وعدوں پہ صیاد کے جاؤ دیکھو
نہ کچھ آؤ دیکھو، نہ کچھ تاؤ دیکھو　　نکل جاؤ، جب راستہ پاؤ دیکھو
اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں

سنہ ۱۹۰۸ء

بھارت کی جے ہو

حُبِّ وطن کی ساغر میں مے ہو — پھر میگساری ہو پے بہ پے ہو
محفل میں بربط ہو یا کہ نے ہو — جو کچھ ہو اس سے پیدا یہ لے ہو

بھارت کی جے ہو! بھارت کی جے ہو!

بھارت میں آئے پھر وہ زمانہ — ہے ذکر جس کا مثلِ فسانہ
پھر سوئے عظمت ہم ہوں رَوانہ — سب کی زباں پر ہو یہ ترانہ

بھارت کی جے ہو! بھارت کی جے ہو!

بھارت کی جے ہو سارے جہاں میں — ہو اس کا چرچا کون و مکاں میں
چمکے سُدیشی ہندوستاں میں — گاتے پھریں ہم اپنی زباں میں

بھارت کی جے ہو! بھارت کی جے ہو!

بھارت کو کر دے آباد، یارب[1] بھارت نواسی ہوں شاد، یارب

ہوں علم و فن میں اُستاد یارب اور مُفلسی سے آزاد، یارب

بھارت کی جے ہو! بھارت کی جے ہو!

ہوں دُور یارب! دشواریاں سب دشمن کا حصّہ ہوں خواریاں سب

بیکار ٹھیریں بیکاریاں سب بھارت سے نکلیں بیماریاں سب

بھارت کی جے ہو! بھارت کی جے ہو!

حُبِّ وطن ہو اہلِ وطن میں دل میں، جگر میں، جان اور تن میں

اُلفت وطن کی ہو مرد و زن میں تھی جس طرح سے دورِ کہن میں

بھارت کی جے ہو! بھارت کی جے ہو!

اہلِ وطن سب کینے بُھلائیں اک دوسرے کے دل میں سمائیں

یارب! وہ دن بھی بھارت میں آئیں ہندو مسلمان مل کر یہ گائیں

بھارت کی جے ہو! بھارت کی جے ہو!

---

[1] جب یہ نظم لکھی گئی شاعر کے ذہن میں مصرع یوں تھا "بھارت کو کر دے آزاد یارب" لیکن وہ زمانہ بہت نازک تھا۔

تِلک اور گوکھلے

خورشید اور قمر ہیں تِلک اور گوکھلے
بھارت میں جلوہ گر ہیں تِلک اور گوکھلے
سوزِ وطن ہے دونوں میں کیا بحث نرم و گرم
اک آگ کے شرر ہیں تِلک اور گوکھلے
فرزند یوں تو مادرِ بھارت کے بے شمار
دو پارۂ جگر ہیں تِلک اور گوکھلے
دونوں کی دھوم بشیۂ حُبِّ وطن میں ہے
واللہ شیرِ نر ہیں تِلک اور گوکھلے

پُتلے ہیں دونوں جذبۂ ایثارِ نفس کے
قربانِ ہند پر ہیں تلک اور گوکھلے
ہوگی ضرور بھارتِ مجروح کو شفا
جب اس کے چارہ گر ہیں تلک اور گوکھلے
ہوگا طُلوع نیّرِ اقبالِ ملکِ ہند
صد پرتوِ سحر ہیں تلک اور گوکھلے

ق

ہیں اپنی اپنی راہ پہ گرمِ روا روی
گویا دگر دگر ہیں تلک اور گوکھلے
دونوں کی ایک منزلِ مقصود ہے مگر
در اصل ہم سفر ہیں تلک اور گوکھلے
محرومؔ ایک گرم ہے اور ایک نرم ہے
خورشید اور قمر ہیں تلک اور گوکھلے

سنہ ۱۹۰۸ء

بھارت جاگا

تاریکیٔ عالم دُور ہوئی　　کافورِ شبِ دیجور ہوئی
دنیا ساری پُر نُور ہوئی　　خلقت جاگی، مسرور ہوئی

مشرق مغرب میں شور مچا
بھارت جاگا، بھارت جاگا

پھر صبحِ وطن ہے خندہ کناں　　پھر شامِ وطن ہے مُشک فشاں
پھر ہند ہُوا ہے رشکِ جناں　　ہے صحنِ چمن سے دُور خزاں

مِل جُل کے طیور ہیں نغمہ سرا
بھارت جاگا، بھارت جاگا

پھر ہم کو وطن سے پیار ہوا　　پھر تن من اس پہ نثار ہوا
پھر بخت ہمارا یار ہوا　　پھر بیڑا اپنا پار ہوا

ہر فردِ بشر پھر گانے لگا
بھارت جاگا، بھارت جاگا

آئی یک جہتی، پھوٹ گئی　　حُسّاد کی قسمت پھوٹ گئی
ہمت اب یاس کی ٹوٹ گئی　　یاس اپنی چھاتی کوٹ گئی

اُمّید نے آ کر مژدہ دیا

بھارت جاگا، بھارت جاگا

کب بھارت والے کاہل ہیں　　سب فرض پہ اپنے مائل ہیں
سب دانا ہیں، سب عاقل ہیں　　اور فضلِ خدا سے کامل ہیں

دو دن میں پلٹتی ہے کایا

بھارت جاگا، بھارت جاگا

اب نیند کہاں وہ غفلت کی　　حالت کچھ اور ہے بھارت کی
باندھی ہے کمر پھر ہمّت کی　　چھُوٹی ہے اُلفت راحت کی

منزل کا پتہ ہے پوچھ رہا

بھارت جاگا، بھارت جاگا

اللہ اثر دے نالوں میں　　اور آہ کے برچھوں بھالوں میں
شامل ہُوں بلند خیالوں میں　　بھارت کے جگانے والوں میں

پہنچے افلاک پہ میری صدا

"بھارت جاگا، بھارت جاگا"

بڑھے چلو

بگڑی ہوئی وطن کی بنا لو، بڑھے چلو
گرتے ہوئے نشاں کو اُٹھا لو، بڑھے چلو
آزاد مثلِ سروِ چمن اور سر بلند
ہندوستاں کے تازہ نہالو، بڑھے چلو
دل میں کدورت اپنے شریکِ سفر سے کیا
گزری گئی پہ خاک ہی ڈالو، بڑھے چلو
گھبرا کے راستے میں نہ بیٹھو، دلاورو
منزل وہ سامنے ہے جیالو، بڑھے چلو
مردانہ خارزارِ غلامی کو طے کرو!
کانٹا بھی پاؤں سے نہ نکالو، بڑھے چلو
منزل بہت قریب ہے، وہ دن نہیں ہے دُور
جب گوہرِ مُراد کو پالو، بڑھے چلو

ہندوستاں ہمارا

گلشن اُجڑ چلا ہے اے باغباں ہمارا
ہونے کو تنکے تنکے ہے آشیاں ہمارا
کس دشت میں الٰہی اب خاک چھانتے ہیں
بادِ بہار اپنی، آبِ رواں ہمارا
مت چھیڑ دل جلوں کو ایسا نہ ہو کہ تجھ کو
اے چرخ پھونک ڈالے سوزِ نہاں ہمارا

وہ دن بھی تھے کہ ہم تھے اور دھاک تھی ہماری

تھے بحر و بر ہمارے، تھا آسمان ہمارا

سر رفعتِ فلک کا جھکتا تھا اپنے آگے

نہ چرخ سے بھی اُونچا تھا آستان ہمارا

اب حال یہ ہُوا ہے، ہم نیم جاں پڑے ہیں

وہ اوجِ برتری میں رُتبہ کہاں ہمارا

سالار تُو اگر ہو اے اتّفاقِ قومی

پالے کہیں تو رستہ یہ کارواں ہمارا

گو زیر دست ہیں ہم، لیکن نہ پست ہیں ہم

اتنے کہ مٹ چکا ہو نام و نشان ہمارا

ہندو ہیں یا مُسلماں ہم اہلِ ہند ہیں سب

محروم، مشترک ہے سود و زیاں ہمارا

جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانی

بہت ہیں قابلِ تحسین وہ دل فگارِ وطن
وطن سے دُور جو ہیں باعثِ وقارِ وطن

مٹا رہے ہیں جو خود اپنے نقشِ ہستی کو
جما رہے ہیں زمانے میں اعتبارِ وطن

غضب کے داغ ہیں غربت زدوں کے سینوں میں
کھِلا ہوا ہے یہ صحرا میں لالہ زارِ وطن

قتیلِ جور ہیں بھارت کی دیویاں سے ہیے
یہ سُن چکے ہیں جوانانِ دیو سارِ وطن

ابھی ہیں واقفِ سوزِ فنا یہ پروانے
ہزار شکر ہے روشن ابھی شرارِ وطن

ہزاروں غنچہ و گُل وقفِ جورِ گلچیں ہیں
نہ محوِ نالۂ خونیں ہو کیوں ہزارِ وطن

چمن کے غنچے وہ معصوم بھارتی بچے
وطن کے پھُول حسینانِ گلعذارِ وطن

گئے تھے چھوڑ کے گھر ان مصیبتوں کے لئے

اسی لئے کہ ہوں غربت میں بیقرارِ وطن؟

ہزار حیف فلک تیری کینہ بازی پر

ملائے خاک میں کیا دُرِ شاہوارِ وطن

خدائے پاک کی رحمت جنابِ گاندھی پر

ہوئی ہے جس کی ہر اک آرزو نثارِ وطن

جسے نہ اپنی ہے پروا نہ بال بچوں کی

فقط یہ دُھن ہے کہ ثابت ہو اقتدارِ وطن

بنا دیا ہے اسے ظالموں نے زندانی

عزیز اہلِ وطن جو ہے، افتخارِ وطن

گورنمنٹ سے فریاد اب ہماری ہے

کہ اے وطن کی محافظ، اے نگاہدارِ وطن

یہ خواہ مخواہ کی ہم سے کدورتیں کیسی

اُڑائے دیتے ہیں اغیار کیوں غُبارِ وطن

سمجھ کے بیکس و تنہا نہ دیں عذاب انھیں

شریکِ حالِ غریباں ہیں سوگوارِ وطن!

نوجوانانِ وطن سے گزارش

قوم کے اے نونہالو! اے جوانانِ وطن
تم سے وابستہ ہے اُمّیدِ گلستانِ وطن

کیا تعجّب؟ اس میں آجائے نئے سر سے بہار
تم اگر ہو جاؤ رونق بخشِ بستانِ وطن

کام ہوتا ہے نہ بوڑھوں سے نہ بچّوں سے کوئی
کیا کریں خدمت وطن کی ناتوانانِ وطن

ہیں تمھارے دست و پا مضبوط، تازہ ہیں دماغ
تک رہی ہے آج تم کو چشمِ حیرانِ وطن

درپئے ایذا ہے جب گردشِ لیل و نہار

شامِ غم سے ہے مبدّل صبحِ خندانِ وطن

کیا مسیحا چرخ سے بہرِ مداوا آئے گا

ہو نہ تم سے گر علاجِ دردِ پنہانِ وطن

گود میں پالا ہے جس نے تم پہ اس کا حق بھی ہے

کچھ اتارا چاہیئے گردن سے احسانِ وطن

وہ عمل ہرگز نہ ہو جس سے کہ رسوا قوم ہو

کام وہ کرنا کہ ظاہر جس سے ہو شانِ وطن

ملک کی خدمت کے لاکھوں کام سوجھیں گے تجھے

ہو اگر تم پیروِ خدمت گزارانِ وطن

جاگزیں دل میں رہے ہر دم سُدیشی کا خیال

ہے یہی نسخہ مجرّب بہرِ درمانِ وطن

ہو وطن میں یا وطن سے دُور تم غربت میں ہو

حُبِّ قومی جان میں ہو اور دل میں ارمانِ وطن

قومی پستی کے آثار

جس قوم کے بچّے بے ادب ہوں
ماں باپ کے موردِ غضب ہوں
جس قوم کی عورتیں ہوں جاہل
اور سوئے فضولیات مائل
جس قوم کے نوجواں ہوں مغرور
رسم و رہِ انکسار سے دُور
جس قوم کے پیر بد زباں ہوں
اور غصّہ و غم سے نیم جاں ہوں
وہ قوم رہے گی پست دائم
ہوگی اُس کو شکست دائم

غزل

نہ وہ ہند رشکِ جناں رہا، نہ وہ اس میں جوشِ بہار ہے
نہ گلوں پہ اب وہ سماں رہا، نہ ترانۂ سنجِ ہزار ہے

نہ دلوں میں ہیں وہ صداقتیں نہ وہ اُلفتیں نہ رفاقتیں
ہیں کدُورتوں پہ کدورتیں تو غبار زیرِ غبار ہے

نہ وہ بزم ہے نہ وہ دَور ہے کہ زمانہ اَور سے اَور ہے
نہ وہ صبح و شام کا طَور ہے نہ وہ طرزِ لیل و نہار ہے

نہ وہ رنگ رُوپ وطن میں ہے جو شبیہِ دورِ کہن میں ہے
نہ ادا وہ گنگ و جمن میں ہے، وہ فضا نہ آر نہ پار ہے

تِلکؔ[1] غریب اسیرِ غم کرے کیا بیانِ وطن رقم
کہ یہ حال لکھتے ہوئے قلم کا بھی سینہ ہوتا فگار ہے

[1] تِلک شاعر کے نام کی تخفیف ہے

ہندو مسلمان

مٹے جھگڑا الٰہی کب یہاں ہندو مسلمان کا
بنے کب مشترک ہندوستان ہندو مسلمان کا

گناہِ بغضِ پنہاں کی سزا بھی کچھ تو ہوتی ہے
نہ دشمن کس لئے ہو آسمان ہندو مسلمان کا

غضب ہے ایک گھر کے رہنے والے یوں لڑیں باہم
جھگڑنا ہے بہم شورِ زنان ہندو مسلمان کا

"کرو تکرار باہم اور گرا دو امن کے گھر کو"
ہدایت یہ کرے مذہب کہاں ہندو مسلمان کا

چلیں اک دوسرے پر وار باری باری دونوں کے
تماشا دیکھنے والا جہاں ہندو مُسلمان کا

سرِ منزل پہنچ بیٹھے کبھی کے قافلے سارے
رہا پسماندہ لیکن کارواں ہندو مُسلمان کا

بہاریں ہند میں کب آئیں اور سرسبز دیکھیں ہم
نہالِ اتّفاقِ جاوداں ہندو مُسلمان کا

پسند آئی مجھے محرومؔ تیری یہ غزل دل سے
کہ ہوتا ہے ملاپ اس سے عیاں ہندو مُسلمان کا

اشعار

کب تک ذِلّت اُٹھائیں گے ہم
ہر حکم پہ سر جھکائیں گے ہم

آقاؤں کی کامرانیوں پر
کب تک خوشیاں منائیں گے ہم

ذلّت کے گڑھوں میں نیچے نیچے
کب تک یونہی گرتے جائیں گے ہم

(نامکمل)

گلشن میں بزمِ گُل کے پھر اہتمام ہوں گے
کب تک خزاں کے جھونکے محوِ خرام ہوں گے

پَر کھول کر فضا میں اک بار اُڑ چکے جو!
صیّاد! ایسے طائر پابندِ دام ہوں گے؟

بیداد و جور سہنا اور مُنہ سے کچھ نہ کہنا
یہ وہ فسُوں ہے جس سے دشمن بھی رام ہوں گے

منزل گہِ تمنّا! یونہی کشش کیے جا
جو آج سُست رَو ہیں کل تیز گام ہوں گے

آہوں سے دل جلوں کی اک روز دیکھ لینا
مستِ شرابِ نخوت آتش بجام ہوں گے

گاندھی نے کی ہے روشن وہ آگ جس سے آخر
بغض و عناد و نفرت جل کر تمام ہوں گے

ترانۂ نَوروز

خورشیدِ عالمتاب نے بدلی قبا نَوروز کی
بستی میں، کوہ و دشت میں پھیلی ضیا نَوروز کی
ہے بھینی بھینی، دل فزا، بادِ صبا نَوروز کی
آسائشِ جان و جگر، ٹھنڈی ہوا نَوروز کی
جاگو اب اے اہلِ وطن، دیکھو فضا نَوروز کی

نَوروز کے نغمے بہم گاتے ہیں مرغانِ چمن
مستوں کی صورت جھومتے ہیں نوجوانانِ چمن
گلہائے رنگا رنگ سے بھرپور دامانِ چمن
فرطِ نمودِ گُل سے ہے صحرا میں سامانِ چمن
جاگو اب اے اہلِ وطن، دیکھو فضا نَوروز کی

ہے صبحِ صادق جلوہ ریز، اے کارواں والو! اٹھو!

مُردوں سے باندھے شرط ہو، اے جسم و جاں والو! اٹھو

باندھو کمر اور چل پڑو، تاب و تواں والو! اٹھو!

اب اُٹھ چکا سارا جہاں، ہندوستاں والو! اٹھو

جاگو اب اے اہلِ وطن! دیکھو فضا نَوروز کی

جاپان کو جاگے ہوئے مُدّت ہوئی، لیکن ابھی

تم اُونگھتے بستر پہ ہو، آنکھیں تمھاری ہیں مُندی

ایرانیوں میں شور ہے "برخیز" کا اور کھلبلی

بیجا تمھاری نیند ہے، جب جاگ اُٹھے بیمار بھی[1]

جاگو اب اے اہلِ وطن! دیکھو فضا نَوروز کی

یہ جاگنے کا وقت ہے، غافل پڑے سوتے ہو کیا!

غفلت کے کانٹے راہ میں اہلِ وطن بوتے ہو کیا

جاگو، اگر کرنا ہے کچھ، عمریں یونہی کھوتے ہو کیا

سستی میں ہیں رسوائیاں، رُسوا بہت ہوتے ہو کیا

جاگو اب اے اہلِ وطن، دیکھو فضا نَوروز کی

---

[1] یعنی ترکی، جسے اہلِ یورپ ایورپ کا مردِ بیمار کہتے تھے

سوتا ہے یاں جو شخص وہ ناعاقبت اندیش ہے

ہے کاہلی سب کی عدو، ہے شاہ، یا درویش ہے

سوتے ہو تم، لیکن تمھیں منزل کڑی درپیش ہے

ہے وعظ واعظ کا یہی، پنڈت کا یہ اپدیش ہے

جاگو اب اے اہلِ وطن! دیکھو فضا نوروز کی

چھوڑو حسد، ہو جاؤ تم اک دوسرے کے میت پھر

ہندوستاں میں تاکہ ہو تازہ وفا کی ریت پھر

سینوں میں، ہاں، پیدا کرو پیارے وطن کی پریت پھر

ہر اک طرف گونجا کریں حبِّ وطن کے گیت پھر

جاگو اب اے اہلِ وطن، دیکھو فضا نوروز کی

اُمن کی دیوی

۱

خوبیٔ قسمت سے کل شب خواب میں امن کی دیوی کے درشن ہو گئے
جلوہ کچھ ایسا تھا حُسنِ پاک کا دیدہ و دل جس سے روشن ہو گئے

۲

ماہتاب آسا سراپا نور تھی ہلکا ہلکا جس پہ تھا ابرِ ملال
چشمِ شفقت پاش تھی جرأت فزا سر جھکا کر یوں کیا میں نے سوال

۳

ایک تجھ سے زندگی دنیا کی ہے! اور دُنیا پوجنے والی تری
دُشمنوں کو کیوں اُداسی ہے نصیب بزم کیوں رونق سے ہے خالی تری

نفسِ حیات ہے تازہ پے، کہ شمیمِ قُدس ہوا میں ہے
یہ زمیں ہے مسکنِ قُدسیاں، ہوس و ہوا کا نہیں نشاں

صلۂ وفا، گلۂ جفا سے یہاں کسی کو غرض نہیں
کہ رہینِ رام ہیں جان و دل وہی رام جو ہے عزیزِ جاں

جو ستم کرے وہ نہیں فلک سے نثارِ اہلِ زمیں فلک
کہیں خدشہ قحط کا ہو اگر، وہیں ابرِ تر ہو گہر فشاں

چلے جاؤ دامنِ کوہ سے جو کنارِ بحرِ رواں تلک
کہیں لہلہاتی ہیں کھیتیاں، کہیں مسکراتے ہیں گلستاں

یہی وہ زمانہ ہے جس کے ہم بہ ہزار شوق ہیں منتظر!
یہ ہیں رام راج کی برکتیں، یہ ہیں رام راج کی خوبیاں

ببیں تفاوتِ رہ......

جو لوگ ہند میں آتے ہیں غیر ملکوں سے

اور اس کو اپنا بناتے ہیں آن کر ماوا

وطن سے اپنے وہ آئے ہوں گو پھٹے حالوں

بدل ہی جاتا ہے دو چار دن میں حال اُن کا

وہ اپنے ملک میں ہر چند کفش دوز بھی ہوں

اُڑاتے دیسیوں کا قینچیوں سے ہیں چمڑا

وطن میں گو نہ میسر ہوں بے نمک آلو!

یہاں اُڑاتے ہیں مکھن کے طشت صبح و مسا

یہ اُن کی شوکت و شان اور یہ عیش کے ساماں
دکھائی دیتا ہے اک اک سکندر و دارا
ہے بسکہ خاکِ وطن میہماں نواز اپنی
کوئی غریب نہ آزردہ اس میں آ کے ہُوا
مگر جو ہند سے جاتے ہیں غیر ملکوں میں
برستے رہتے ہیں اُن پر ہمیشہ تیرِ بلا
کہیں تو اُن کے لئے بنتے ہیں نئے قانون
کہ جن سے پہلو نکلتا ہے صاف ذلّت کا
کہیں ہے داخلہ ہوٹل میں بند ہندی کا
کہ نام اُس کا فرنگی نے رکھ دیا کالا
ہمارے ملک میں چاندی ہے اجنبیوں کی
دیارِ غیر میں اپنا نصیب ہے کھوٹا
یہ اُن کے واسطے گھر اور ہمیں وہ مثلِ سقر!
"ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا"

صبحِ وطن

۱

شیدا ہے دلِ بیتاب ترا جاں تجھ پہ نثار، اے صبحِ وطن
کیا دلکش ہیں، کیا روح فزا تیرے انوار، اے صبحِ وطن

۲

جب اوّل اوّل آنکھ کھلی اپنی دنیائے فانی میں
تسکینِ دلِ معصوم ملی تیرے رُوئے نورانی میں

۳

تُو بچپن سے ہے رفیق اپنی دل سوز ہے تو، دمساز ہے تُو
ہر حالت میں ہے شفیق اپنی ہمدم ہے تُو، ہمراز ہے تُو

۴

جب بستر سے ہم شاد اُٹھے خنداں اور فرحاں تُو آئی
جب کُشتۂ تیغِ ملال ہوئے با چاکِ گریباں تُو آئی

۵

جذباتِ وفا و اُلفت کو کرتا ہے قوی تر دم تیرا
اکسیر ہے دل کی جراحت کو یہ کافُوری مرہم تیرا

۶

پروازِ تخیّل نے اُڑنا　　سیکھا ہے تیری فضاؤں میں
بُو باس ہے جنّت کی گویا　　کیا لطف ہے تیری ہواؤں میں

۷

دلدادہ نئے نظّاروں کے　　پھرتے ہیں کہیں مارے مارے
ہم دیکھ رہے ہیں گھر بیٹھے　　منظر تیرے پیارے پیارے

۸

تیرے جلوؤں نے طلائی کیا　　تاجِ سیمینِ ہمالا کو
تو نے زرکش ملبوس دیا　　ندّی نالوں کو، دریا کو

۹

کس درجہ بھرا ہے سوزِ ازل　　ناقُوس کے گہرے نالوں میں
فریاد کناں ہیں گجر بے کل　　کیا دھوم مچی ہے شوالوں میں

۱۰

اوم اوم کے نغمے گونج اُٹھے　　گنگا جمنا کے کناروں سے
کوئل کے الاپ وہ درد بھرے　　پھر اُٹھنے لگے گلزاروں سے

۱۱

مسجد سے اُٹھی آوازِ اذاں　　سوتی دنیا کے جگانے کو
بیدار ہوئے دیندار چلے　　سجدوں کی سعادت پانے کو

۱۲

کشمیر سے راس کماری تک　　بزمِ قدرت میں ہل چل ہے
پھولوں کی مہک، بلبل کی چہک　　ہر اک جنگل میں منگل ہے

شامِ وطن

۱

کیا سانولی صورت ہے تیری — اے شامِ وطن، اے شامِ وطن
کیا موہنی مورت ہے تیری — اے شاہدِ لیلیٰ فامِ وطن

۲

ہاں صبحِ ازل سے شامِ وطن — سودا ہے تیری ملاحت کا
پہلو میں دلِ شیدائے محن — پروانہ ہے شمعِ الفت کا

۳

کیا خوب کِھلایا قدرت نے — رنگیں یہ ترا گلزارِ شفق
اور ہم کو بنایا قدرت نے — سرمستِ مئے گلنارِ شفق

۴

دنیا میں برائے قلبِ تپاں — تسکین ترے آغوش میں ہے
آرامیدہ دل کا ارماں — تیری بزمِ خاموش میں ہے

۵

پُر نور ہیں نورِ مسرت سے — ہر قریہ میں، گاؤں میں جھونپڑیاں
دکھلاتی ہیں نقشے محلوں کے — تیری اِس چھاؤں میں جھونپڑیاں

۶

واپس چوپائے، چرواہے — کھیتوں سے گھروں کو آتے ہیں
گھنٹی کی صدا سے، گیتوں سے — کیا دل کو لُوٹے جاتے ہیں

۷

رخشندہ چراغوں کے جویا — جمگھٹ نکلے پروانوں کے
دکھلاتے ہیں لطف چراغاں کا — جگنو تیرے میدانوں کے

۸

کیا کہنا اُس کے ترنم کا ندی جو رواں میدان میں ہے
موقوف ہے جوشِ تلاطم کا گویا یہ گھرے دھیان میں ہے

۹

اے شام! یہ مطلعِ صاف ترا اور جگمگ اس پہ ستاروں کی
دلکش یہ فضا، یہ سرد ہوا اور خوشبو اس میں بہاروں کی

۱۰

اے شامِ وطن! گیسو تیرے ہیں جب سے وقفِ پریشانی
افسردہ ہیں دل جو تیرے رہتے ہیں رہینِ حیرانی

۱۱

اے کاش کبھی اے شامِ وطن تو شاد ہو گردشِ دوراں میں
آنکھوں سے دُور رہا جامِ وطن پھر دیکھیں تیری شبستاں میں

بزمِ نَو

بھارت کے نوجوانو! اک بزمِ نَو بنائیں
حُبِّ وطن کی شمعیں اُس بزم میں جلائیں

ہو بزمِ نَو ہماری خجلت دہِ گلستاں!
بلبل سے بڑھ کے چہکیں، گُل ہو کے کھلکھلائیں

حُبِّ وطن کی مے کا چلتا ہو دَور پیہم
بھر بھر کے جام و ساغر باہم پئیں، پلائیں

یہ عُمر اور اس میں یہ بیدلی ستم ہے
سارا زمانہ خوش ہے، ہم بھی خوشی منائیں

پژمردہ ہو رہے ہیں گُلہائے نوجوانی
تاراج کر رہی ہیں کیوں بس بھری ہَوائیں

ہے موجبِ خجالت ہندوستاں کی پستی
اُٹھو، بہ عزمِ صادق مِل کر اسے اُٹھائیں

ہستی کے مدّعا کو پورا کیا ہے جس نے
اِس عُمر میں اگر ہم بھارت کے کام آئیں

جب ڈھل گئی جوانی اور آگیا بڑھاپا
اُس وقت سر پہ نازل ہوں گی کئی بلائیں
معلوم ہے یہ کس کو کے دن کی زندگی ہے
کیوں فرض کو ہم اپنے ناکردہ چھوڑ جائیں
لیکن وہ محفلِ نَوا سے دوستو کہاں ہو
کس وضع کی عمارت، کیسا مکاں بنائیں
کیوں قید ہو مکاں کی محدود کیوں رہیں ہم
وسعت بھی کوئی شے ہے اس پر نظر جمائیں
وسعت طلب بنائیں دل کو تو پھر مزا ہے
ایک ایک دل میں سو سو ہندوستاں سمائیں
محفل کا صحن سمجھیں بھارت کی سرزمیں کو
آئیں کہیں نہ جائیں جلسے یہیں جمائیں
شوریدگانِ اُلفت رہتے ہیں کب مکاں میں
یہ رسم ہے پُرانی ہم بھی اسے چلائیں
اک دوسرے سے کوسوں ہم دور ہوں تو کیا ہے
مطلب یہ ہے دلوں کے کچھ فاصلے گھٹائیں

مل کر اگر نہ بیٹھیں کچھ غم نہیں ہے اس کا

لیکن دلوں کو باہم اک بزم میں ملائیں

بھارت کے غم میں گریاں اس کی خوشی میں شاداں

اپنے غموں کو چھوڑیں، اپنی خوشی بھلائیں

بھارت کے جب چمن میں فصلِ بہار آئے

اونچے سُروں میں ہم بھی مل کر بسنت گائیں

بھارت میں خشک سالی کا جب ہو دور دورہ

دریائے اشک اپنی آنکھوں سے ہم بہائیں

اہلِ وطن پہ نازل ہو جب کوئی مصیبت

درگاہِ ایزدی میں دستِ دُعا اٹھائیں

ہندوستاں کا گلشن پُھولے پھلے الٰہی!

تیرے کرم کی اس پر برسیں سدا گھٹائیں

علم و ہُنر کے گُل ہوں ہر اک طرف شگفتہ

صنعت کے بیل بُوٹے اپنی ادا دکھائیں

اپنے وطن کے غم میں ہے دلفگار یہ بھی

مقبول ہوں الٰہی محروم کی دعائیں

ہمّت کرو جوانو!

اے کاش مُلک اپنا خوفِ ضرر سے نکلے

اور قوم دستِ چرخِ بیدادگر سے نکلے

دیرینہ سوگ یارب ہر ایک گھر سے نکلے

اور نغمۂ مسرّت دیوار و در سے نکلے

ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

لو ٹل گئیں گھٹائیں اب صاف آسماں ہے

وہ زور شور پہلا طوفان کا کہاں ہے

آئی ہوا موافق، تیّار بادباں ہے

چپّو چلاؤ یارو، گر تم میں کچھ تواں ہے

ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

کیسا ہی پُر فضا ہے وہ سامنے کنارا
باغِ عدن کھلا ہے جنّت ہے آشکارا
طوفاں سے بچ گئے ہو ہمّت کرو دوبارا
جاں لے گئے سلامت، دل کو اگر اُبھارا
ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

بے فکر کیوں پڑے ہو کچھ ہاتھ بھی ہلاؤ
گرداب سے نکل کر چاہو مزے اُڑاؤ
ساحل بھی سامنے ہے پھر بھی نہ ہو بچاؤ
غیرت ہے اپنی ہستی گر اس طرح مٹاؤ
ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

ڈوبے اگر یہاں تم یہ لوگ کیا کہیں گے
ہاں تم کو ننگِ غیرت سب برملا کہیں گے
ناکارہ سست ہمّت، گُذرا گیا کہیں گے
اس سے بھی بڑھ کے شاید تم کو بُرا کہیں گے
ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

غفلت سے باز آؤ۔ فرصت ہے کوئی دم کی
ایسا نہ ہو کہ دیکھو پھر راہ سب عدم کی
چھا جائیں سر پہ ہو کر طوفاں گھٹائیں غم کی
گر جائے آسماں سے بجلی کوئی ستم کی
ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

کشتی بھنور سے نکلی کوشش سے گر تمھاری
شاباش تم کو دے گی خوش ہو کے خلق ساری
اپنی بھی جاں بچے گی، عزّت بھی ہوگی بھاری
درکار ہے دلیرو اک دم کی ہوشیاری
ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

ہمّت کرو جوانو! ہمّت کے آسمانو!
گر کچھ دلاوری ہے دکھلاؤ پہلوانو!
ہاں جوشِ نوجوانی ظاہر کرو جوانو!
گُرد آزما دلیرو، میدان کے یگانو
ہمّت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

دکھلاؤ زورِ بازو، جھنجھلاؤ شیر مردو
گر کچھ ہے سمٹ دریا، چھاتی کو چاک کر دو
موجِ فنا کے منہ کو مٹی سے اُٹھ کے بھر دو
اپنی سلامتی کی بدخواہ کو خبر دو
ہمت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

کشتی جو قوم کی ہے منجدھار میں پھنسی ہے
کشتی سوار حیراں، حسرت ہے بے کسی ہے
مایوس ہو رہے ہیں اور دل کو بے کلی ہے
ہے آسرا خدا کا اُمید اک یہی ہے
ہمت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

کامِ نہنگِ طاعوں چاروں طرف کھُلا ہے
منڈلاتی پھرتی ہر سو افلاس کی بلا ہے
غفلت کی کالی کالی چھائی ہوئی گھٹا ہے
بہرے اگر نہیں ہو محروم کی صدا ہے
ہمت کرو جوانو! کشتی بھنور سے نکلے

گھر سے نکل کے دیکھو!

کب تک ذلیل رہنا، اے آن بان والو!
کب تک یہ قعرِ پستی اُونچے نشان والو!
کب تک سَلَف پہ نازاں اے عزّ و شان والو!
بے حِس رہو گے کب تک اے جسم و جان والو!
گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

اے اہلِ ہند تم کو دولت بُلا رہی ہے

دولت بُلا رہی ہے، قسمت بُلا رہی ہے

صنعت بُلا رہی ہے، حرفت بُلا رہی ہے

عزّت بُلا رہی ہے، شہرت بُلا رہی ہے

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

چلنا اگر نہ آئے، آبِ رواں سے سیکھو

آبِ رواں سے سیکھو، بادِ وزاں سے سیکھو

گردش اگر نہ آئے، کچھ آسماں سے سیکھو

اٹھنا اگر نہ جانو میری فغاں سے سیکھو

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

دلکش ہیں گھر کی خوشیاں، پر وہ بھی آہ کب تک

دیوار و در پہ اپنے قائم نگاہ کب تک

ایسی خوشی سے ہوگا آخر نباہ کب تک

کب تک خیالِ راحت، یہ حُبِّ جاہ کب تک

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

عِلم و ہُنر کا چرچا دُنیا میں ہو رہا ہے

صنعت کا بول بالا دُنیا میں ہو رہا ہے

سائنس کا تماشا دُنیا میں ہو رہا ہے

دیکھو ذرا تو کیا کیا دنیا میں ہو رہا ہے

گھر سے نِکل کے دیکھو ہندوستان والو!

جاپان ہو کے آؤ، یُورپ میں پھیل جاؤ

امریکہ جا کے ٹھیرو، افریقہ جا لباؤ

کچھ اُن کو جا سِکھاؤ، کچھ اُن سے سیکھ آؤ

علم و ہُنر کی دولت دنیا سے کھینچ لاؤ

گھر سے نکل کے دیکھو ہندُستان والو!

کیا کیا ہے بحر و بر میں گھر سے نکل کے دیکھو!

کیا لُطف ہے سفر میں، گھر سے نکل کے دیکھو

ہے کیا مزا ظفر میں گھر سے نکل کے دیکھو

تم کیوں پڑے ہو گھر میں، گھر سے نکل کے دیکھو

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

ملکوں کی دوڑ میں اک اے ہند رہ گیا تو
تجھ سے نکل گئے ہیں کتنے ہی چھو کے پہلو
عالم میں ہے روا رو، قوموں میں ہے تگاپو
دنیا میں ہے چلا چل اک ہمہمہ ہے ہر سُو
گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

پیغام لا رہی ہے بادِ صبا، سُنو تو!
کس کو پکارتی ہے، کہتی ہے کیا سنو تو
مغرب سے آرہی ہے کس[1] کی صدا سنو تو
شیدا کوئی وطن کا ہے کہہ رہا سنو تو
گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو

[1] شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے ولایت سے ایک مضمون بھیج کر رسالہ مخزن لاہور میں شائع کرایا تھا۔
عنوان تھا "گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!"

نشاطِ نوروز

مژدۂ نوروز لے کر صبحِ خنداں آگئی
مُردہ ارمانوں کی جاں میں پھر نئی جاں آگئی
مطلعِ اُمّید سے نکلی شعاعِ جاں فروز
تا سرِ بالینِ غفلت آشنایاں آگئی
چونک اُٹھے وارفتگانِ خوابِ غفلت چونک اُٹھے
نیند کیسی، دھوپ جب سر پر شتاباں آگئی
لذّتِ ہستی جسے مدّت ہوئی بھولے ہوئے
یاد ہم کو صورتِ خوابِ پریشاں آگئی

بھر کے آہِ سرد بولا عاشقِ اندوہ گیں

مژدہ باد اے دل نسیمِ کوئے جاناں آگئی

بن کے ساقی، مے پرستو! آج صبحِ سالِ نو

لے کے جامِ آفتابِ جلوہ افشاں آگئی

مطلعِ مستانہ گاتی بلبلِ شیراز کا

عندلیبِ زار تا صحنِ گلستاں آگئی

"صبحِ دولت میدمد، کو جامِ ہمچوں آفتاب

فرصتے زیں بہ کجا یابم، بدہ جامِ شراب"

بزمِ ساقی میں ہو ایسا اہتمام اب کے برس

تا بہ شیخ و شاب پہنچے دورِ جام اب کے برس

طالبانِ بادۂ حُبِّ وطن سیراب ہوں

کوئی بھی رہنے نہ پائے تشنہ کام اب کے برس

پختہ کارانِ محبت کی نگاہِ فیض سے

ایک ہندی بھی نہ رہنے پائے خام اب کے برس

سال کیا اچھا ہے یہ اقوامِ عالم کے لئے

ہو گئے آزاد صدیوں کے غلام اب کے برس

تا بہ کے بے اعتنائی، خوابِ غفلت تا کجا؟
ہندیو! لے کر اُٹھو اللہ کا نام اب کے برس

منزلِ مقصود خود لینے چلی آئے قدم
تم جو ہو جاؤ ذرا بھی تیز گام اب کے برس

پھر وہی تم اور وہی ہے گردشِ لیل و نہار
دوستو! کرتے رہے گر صبح و شام اب کے برس

"مدّتے شد کآتشِ سودائے[1] اندر جانِ ماست
ایں تمنّا ہیں کہ دائم در دلِ حیرانِ ماست"

[1] سودائے او در جانِ ماست (حافظ)

آئینۂ حال

یہ وہ حال ہے جس کو ماضی ہوئے تیس چالیس برس ہو چکے ہیں۔ (محروم)

ذرا اغیار پر دونوں کو ہے ذوقِ جبیں سائی

کہ برپا ہندو و مسلم میں ہے ہنگامہ آرائی

انھیں برباد ہو کر بھی سمجھ اتنی نہیں آئی

نفاق ایسی بری شے ہے جو پربت کو کرے رائی

قریبِ ساحل اپنے ملک کا بیڑا ڈبونے کو

یہ بحثِ کفر و ایماں وقت پر یاروں کو یاد آئی

عمل بیرا ہوں مذہب پر اگر مذہب کے دیوانے

بہم دیگر گریباں گیر کب ہوں مثلِ سودائی

اگر ہو پاس کچھ بھی دل میں اپنے اپنے مذہب کا
تو ناممکن کہ پھر ہو ان میں تابِ شورش افزائی
پیامِ روح ہے امن و امان و صدق و حق کوشی
فساد و فتنہ و شر نفس کی ہے کارفرمائی
غلامِ نفس ہیں اور آڑ لیتے ہیں یہ مذہب کی
خدا کے قہر سے ڈرتے نہیں مطلب کے شیدائی
"خدا شرّے برانگیزد کہ در آں خیرِ ما باشد"
یہی ہے آرزو اُن کی، اسی کے ہیں تمنّائی
نزاعِ باہمی سے اب وہ زائل ہوتی جاتی ہے
بدقّت قوم نے حاصل جو کی تھی کچھ توانائی
بہم لڑ بھڑ کے کھو بیٹھیں گے دونوں آبرو اپنی
یہ اپنے ہاتھ سے ہونے لگے ہیں وقفِ رسوائی
تمیزِ خیر و شر اِن کو خدائے پاک و برتر دے
کرے گی کیا اثر محرومؔ تیری خامہ فرسائی

غزل

پائمالِ بختِ بد ہندوستاں کیوں کر ہُوا؟
گُلشنِ شاداب تاراجِ خزاں کیوں کر ہوا؟

آسماں کیوں کر ہُوا بدخواہ اپنا دوستو!
دشمنِ اہلِ وطن دَورِ زماں کیوں کر ہُوا؟

جھڑ گئے کملا کے سارے صنعت و حرفت کے پھول
سر بسر بے برگ نخلِ گلفشاں کیوں کر ہُوا؟

بھیم و ارجن سے کبھی یودھا ہوئے جس مُلک میں
آج وہ اتنا نحیف و ناتواں کیوں کر ہُوا؟

رُوح پھُونکی جس نے جا کر پیکرِ اقوام میں
آہ! وہ علم و ادب خود نیم جاں کیوں کر ہُوا؟

شوکتِ دیرینہ اپنی کس طرح یارب مِٹی
آشنائے قعرِ پستی آسماں کیوں کر ہُوا؟

جس کی آوازِ جرس تھی سازِ فطرت کی صدا
دشتِ ہستی میں تلف وہ کارواں کیوں کر ہُوا؟

چار آنسو

فخرِ ہند گوپال کرشن گوکھلے کی وفات پر

مانگ رہا تھا غیب سے جس کی بقا تمام ہند
سوگ میں آج اُس کے ہے بزمِ عزا تمام ہند

بخت کی نارسائی سے، چرخ کی کج ادائی سے
ہو گئی آہِ نارسا، تیری دُعا، تمام ہند

فخرِ زمانہ کون سا آج جہان سے چل دیا
وقفِ الم ہے اک جہان، محوِ بکا تمام ہند

مادرِ ہند کا سپُوت، تیرے غمِ فراق میں
آج ہے داغ خوردۂ سوزِ فنا تمام ہند

تیری جگر فگاریاں یاد رہیں گی حشر تک
یاد کرے گا فخر سے تجھ کو ترا تمام ہند

ہند کے جو فدائی ہوں وہ نہ جئیں، ہزار حیف
وقت سے پہلے چل بسیں، گردشِ روزگار حیف
مرگِ اُمیدِ ہند ہے، تیری وفات گوکھلے
زندگیٔ اُمید تھی تیری حیات گوکھلے
حُبِّ وطن کا آہ تو نیّرِ تابناک تھا
پھر وہی غم نصیب ہیں، پھر وہی رات گوکھلے
استقلال وہ ترا، شانِ مدبّری تری
لائیں گے اب کہاں سے ہم نیک صفات گوکھلے
گرم سفر تھا کارواں، اور وہ میرِ کارواں
راہ میں آہ پڑ گیا موت کے ہات گوکھلے
ہم کو بھی راستہ کوئی تجھ کو دکھا کے جانا تھا
قطعِ رہِ عدم تو تھی بات کی بات گوکھلے
ہو گا وطن پہ آہ اب تیری طرح نثار کون؟
تو ہی نہیں تو ہند کا بیڑا کرے گا پار کون؟

۱۹۱۵ء

یادِ تلک

تلک مہاراج کی پہلی برسی پر

ہو گیا تجھ کو سدھارے ایک سال — جانبِ فردوس، اے غمخوارِ ہند
اک برس سے رو رہا ہے سیل سیل — تیرے غم میں دیدۂ خونبارِ ہند
ہائے وہ روزِ سیہ، جب ہو گئی — شامِ حرماں صبحِ پُرانوارِ ہند
کارواں کو چھوڑ کر تُو چل دیا — دشت میں اے کارواں سالارِ ہند
رایتِ اُمید جھک کر رہ گیا — حریت کے اے علمبردارِ ہند
اے تلک، اے یوسفِ مصرِ وطن — باعثِ صد گرمیٔ بازارِ ہند
قید ہو کر ذوقِ آزادی دیا — ہند کو اے سرورِ احرارِ ہند
فیضِ شامل سے ترے آیا نظر — اختتامِ دورۂ ادبارِ ہند

منتظر جس دن کے تھے، وہ ہے قریب
کوئی دن میں دُور ہے آزارِ ہند

تِلک مہاراج کی یاد میں

دوسری برسی پر

نسلیں ہمارے بعد جو آئیں گی ہند میں
آزاد، بامراد، جواں بخت، شادکام
خوددار، حق پرست، غیور اور ارجمند
جاں باز، سربلند، جری، صاحب احتشام
تاریخِ عہدِ کہنہ پہ ڈالیں گی جب نظر
جس عہد میں ابھی ثمرِ حریت تھا خام
وہ عہد جس میں اُن کے بزرگانِ رفتہ کو
خوفِ تفنگ و تیر سے رہنا پڑا غلام

عنوانِ سُرخ سے نظر آئے گا جب اُنھیں
دورانِ امن و عدل میں ڈائر کا قتلِ عام
بازارِ قید و بند کی گرمی کا ماجرا
ہر گام پر زبان و قلم کی وہ روک تھام
اُبلے گا اُن کا خونِ حمیّت دلوں میں خوب؛
اور جوشِ دل سے آئے گا لب پر تِلک کا نام
بیٹھیں گے جب کہ بزم میں یارانِ زندہ دل
گردش میں آئے گا مئے حُبّ وطن کا جام
یا رفعِ دشمنانِ وطن کے لئے کبھی
جائیں گے لے کے رزم میں جب تیغِ بے نیام
با صد ہزار جوشِ عقیدت، خلوصِ دل
اُن کی زباں پر آئے گا پہلے تِلک کا نام
پھرتا ہے اک سماں مری نظروں کے سامنے
نوروزِ حُرّیت کا وہ ہوتا ہے اہتمام
پیر و جوان و طفل ہیں کیا کیا شگفتہ رُو
ہے فیضِ سُرخروئی سے ہر ایک لالہ فام

ہر سُو میں شادیانے مسرّت کے بج رہے
ہر ایک سمت جشن کی برپا ہے دُھوم دھام

لہرا رہا ہے پرچمِ اقبالِ ملکِ ہند
جُھک جُھک کے کر رہا ہے جسے آسماں سلام

اور دیکھئے ذرا سرِ پرچم فضا میں کیا
زرّیں حُروف میں ہے چمکتا تِلک کا نام

زندۂ جاوید

تِلک مہاراج کی یاد میں

جہاں میں سرفروشوں کی ہے باقی داستاں جب تک
قوی اس داستاں سے ہے دلِ اہلِ جہاں جب تک
غلامی اور آزادی میں جب تک جنگ جاری ہے
اور اس کے بعد آزادی کا لہرائے نشاں جب تک
قفس میں رہنے والوں کے دلِ مضطر کو تڑپائے
بہارِ سبزہ و گلشن میں یادِ آشیاں جب تک
دلِ احرار کو جب تک جفا ہے باعثِ نفرت
وفا باقی ہے جب تک اور وفا کا امتحاں جب تک

ہے جب تک مایۂ فخرِ ملل آئینِ خود داری
پئے اقوام ہے دُوں ہمّتی ذِلّت نشاں جب تک
دلوں میں جب تلک ہے جذبۂ حُبّ وطن باقی
لہُو میں اس سے ہو جاتی ہیں پیدا گرمیاں جب تک
مُحبّانِ وطن کے کارنامے بزمِ عالم میں
سراپا جوشِ دل ہو کر رہیں وقفِ بیاں جب تک
رہے گا دہر میں ذکرِ گرامی اے تلک تیرا
کہ مر سکتا نہیں ہے نامِ نامی اے تلک تیرا

دیپ مالا کے چراغ

نگاہِ دیدۂ ظاہر میں گو چراغ ہیں یہ
چراغ ان کو نہ کہیے جگر کے داغ ہیں یہ

جگر کے داغ ہیں، سوز دروں کے شعلے ہیں
کسی کی آتشِ داغِ جنوں کے شعلے ہیں

چراغ ان کو نہ سمجھو، ذرا اگر سمجھو
کسی کی آہِ شرر بار کے شرر سمجھو!

شرر بھی ایسے کہ ہو فوق برق پر ان کو!
ہو برق ابر میں پوشیدہ دیکھ کر ان کو!

ہوا زمانہ کہ آتش بجاں ہے مادرِ ہند
ہے باوجودِ چراغاں سیاہ اخترِ ہند

یہ جوشِ سوزِ دروں کی ہے فراوانی
کہ تن سے پھوٹ پڑے داغہائے پنہانی!

ترانۂ اُمّید

وہ دن بھی نہیں ہیں دُور کہ جب بھارت کا ستارا چمکے گا
دیکھے گا مغرب مشرق کو جب بخت ہمارا چمکے گا
پھر ہند میں شاہدِ حبّ وطن کا روئے دل آرا چمکے گا
جب جلوۂ حُسنِ قدیمی کا پائے گا اشارا چمکے گا

جس سے کہ دلوں میں سوز رہا جو آنکھ میں اشک افروز رہا
دیکھیں گے ہم اپنی آنکھوں سے پھر وہ ہی شرارا چمکے گا

وحدت کا نورِ ہمالہ پر برسے گا رحمتِ باری سے
فیضانِ پرتوِ معنی سے گنگا کا کنارا چمکے گا

پھر اوجِ سپہرِ قومی پر اقبال کے تارے نکلے ہیں
کہتے ہیں منجّم دنیا کے یہ دیش دوبارا چمکے گا

مصنوعی تری تہذیب ہے یہ اے مغرب اس پر ناز نہ کر
تارے کی طرح گو اوج پہ ہو، کیا خاک غبارا چمکے گا

محروم رہیں گے کب تک ہم، مغموم رہیں گے کب تک ہم
دل شاد ہو اب اے اہلِ وطن بھارت کا ستارا چمکے گا

شعاعِ اُمّید

جلوۂ صبحِ یقینی ہے شبِ تار کے بعد
دَورِ اقبال ہے ہر قوم کو ادبار کے بعد

قافلے والے اس امّید پہ ہیں گرمِ سفر
منزلِ عیش ہے قطعِ رہِ پُرخار کے بعد

چھوڑ مت دامنِ اُمّید مصائب میں کہ ہے
دستِ گلچیں میں گُلِ تر خلشِ خار کے بعد

موت آزارِ دل و جاں ہے بظاہر لیکن
زندگی اور بھی ہے موت کے آزار کے بعد

قابلِ رحم تو ہو جائے دلِ غمدیدہ
نگہِ لطف بھی ہوگی ستمِ یار کے بعد

جہدِ ہستی سے نہ گھبرا کہ نمایاں ہوگا
دورۂ امن و اماں گرمیٔ پیکار کے بعد

شعر تیرے بھی دل آویز ہیں محروم، مگر
کیا لکھے گا کوئی اقبال کے اشعار کے بعد

وطن کے دردِ نہاں کی دوا سُدیشی ہے
غریب قوم کی حاجت روا سُدیشی ہے

تمام دہر کی رُوحِ رواں ہے یہ تحریک
شریکِ حُسنِ عمل جابجا سُدیشی ہے

ثبوت ہے یہی اپنے وطن کی اُلفت کا
عزیزِ خاطرِ اہلِ وفا سُدیشی ہے

قرارِ خاطرِ آشفتہ ہے فضا اس کی
نشانِ منزلِ صدق و صفا سُدیشی ہے

وطن سے جن کو محبّت نہیں، وہ کیا جانیں؟
کہ چیز کون بدیشی ہے، کیا سُدیشی ہے
اِسی کے سائے میں پاتا ہے پرورش اقبال
مثالِ سایۂ بالِ ہُما سُدیشی ہے
اسی نے خاک کو سونا بنا دیا اکثر
جہاں میں گر ہے کوئی کیمیا، سُدیشی ہے
فنا کے ہاتھ میں ہے جانِ ناتوانِ وطن
بقا جو چاہو تو رازِ بقا سُدیشی ہے
ہوا اپنے ملک کی چیزوں سے کیوں ہمیں نفرت
ہر ایک قوم کا جب مدّعا سُدیشی ہے

اِنقلابِ دہر

باہمی فسادات کو دیکھ کر

دورِ زماں جو دشمنِ امن و اماں ہوا
برہم نظامِ کشورِ ہندوستاں ہوا
جینا یہاں کا باعثِ آزارِ جاں ہوا
دوزخ نما یہ خطۂ جنت نشاں ہوا
کیا انقلابِ دہر کدورت فشاں ہوا
بادِ سحر چلی تو بگولا عیاں ہوا
گھیرا تمام ملک کو نفرت کی آگ نے
دل داغدار کردئے ناحق کی لاگ نے

اہلِ وطن میں آہ، وہ صدق و صفا کہاں
وہ لُطفِ درمیانہ، وہ مہر و وفا کہاں
ہمسائیگی کی صحبتِ صبح و مسا کہاں
لیل و نہار اب وہ گئے اے خدا کہاں
لے جائے ہم کو یہ ستمِ ناروا کہاں
اس ابتدا کی دیکھئے ہو انتہا کہاں؟

پائے کہاں سکوں دلِ بیتاب دیکھئے
بیڑا کہاں وطن کا ہو غرقاب دیکھئے

ہمسائے تھے جو صدیوں کے آپس میں لڑ گئے
اِس کُشت و خوں سے بستے ہوئے گھر اُجڑ گئے
قسمت سے آہ! تفرقے یاروں میں پڑ گئے
جو جُھک کے ملنے والے تھے باہم، اکڑ گئے
جھنڈے عناد و بغض و عداوت کے گڑ گئے
یہ دیکھ کر اُمید کے پاؤں اُکھڑ گئے

ابتر جو دام و دو سے مکینوں کا حال ہو
اُس گھر پہ کیوں نہ بارشِ تیرِ ملال ہو

لیتے اگر ذرا نگہِ دُور بیں سے کام
آتے نظر نتائجِ کین و حسد تمام
فتنے نہ اُٹھنے پاتے، جو اُٹھتے ہیں صبح و شام
ہوتی نہ اہلِ امن پہ یوں زندگی حرام
رہنا ہے مل کے دونوں کو اِس ملک میں مدام
مِٹتا نہیں ہے کوئی بھی، ہوں لاکھ قتلِ عام
پھرتے ہیں آج جو نفسِ آتشیں لئے
آئیں گے کل نظر عرق افشاں جبیں لئے

پھر بھی لڑتے ہیں!

رُسوا وطن ہُوا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
پامالِ صد جفا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
ذِلّت کی انتہا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
لڑنا بہت بُرا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
دونوں کا اک خُدا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

خالق ہے ایک دونوں کا معبُود ایک ہے
رستے الگ ہیں، منزلِ مقصُود ایک ہے
اک زاد بُوم اور زیاں سُود ایک ہے
دونوں کے واسطے رہِ بہبُود ایک ہے
کچھ بھی نہیں جُدا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

ایماں کا جُزو امن ہے یہ جانتے بھی ہیں!
ممنُوع ہے فساد، اسے مانتے بھی ہیں
امن و اماں کی قدر کو پہچانتے بھی ہیں
یہ بات اپنے دل میں کبھی ٹھانتے بھی ہیں
"اب صلح مدّعا ہے" مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

صدق و صفا کو چھوڑ کے، بن کر سیاہ کار
اک دوسرے پہ کرتے ہیں تیغ و سناں کے وار
بستے ہوئے گھروں کو بناتے ہیں شعلہ زار
خود کو مٹا کے ہوتے ہیں رُسوائے روزگار
لڑنے کی یہ سزا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

یہ بھی غلام غیر کے، وہ بھی غلام ہیں!
کرتے ہیں روز و شب جو غلاموں کے کام ہیں
مجبور و بے نوا ہیں کہ پابندِ دام ہیں
نے پرفشاں ہوا ہیں، نہ بالائے بام ہیں
کُنجِ قفس ملا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

کُتّے نہیں کہ کوئی لڑائے تو ہم لڑیں!
لاشیں ہماری کوچہ و بازار میں سڑیں
لڑنے سے باز آئیں جو نہی جُوتیاں پڑیں
کچھ شرم ہو تو خاکِ حمیت میں ہم گڑیں
سب کچھ سمجھ لیا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

اہلِ وطن ذرا تو کریں دل میں غور ہم
دُنیا کو کیوں دکھاتے ہیں وحشت کے طور ہم
ہندوستاں میں کون سا لاتے ہیں دَور ہم
ہوتے ہیں کیوں ذلیل سوا اس سے اَور ہم
ذلّت کی انتہا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

غریب الوطن

لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی پر

وطن کی یاد میں ہوں بے قرار غربت میں
کوئی رفیق نہ مونس، نہ یار غربت میں
قدم کو چومنے آتے ہیں خار غربت میں
بغیر اس کے نہیں کچھ وقار غربت میں
جگر کے داغ ہوئے لالہ زار غربت میں
یہی ہے جوششِ فصلِ بہار غربت میں
دیارِ غیر کو پنجاب ہم بنا دیں گے
ہوئے ہیں دیدۂ تر اشکبار غربت میں

جو دن پہاڑ سا ہے، رات اس سے بھاری ہے

کٹیں تو کس طرح لیل و نہار غربت میں

جگر سے ہُوک اُٹھی آہ! جب کہ یاد آیا

عروسِ صبحِ وطن کا نکھار غربت میں

ہے یاد آتی وہ شبنم وطن کے باغوں کی

غریب روتے ہیں زار و قطار غربت میں

بندھی ہے رشتۂ یادِ وطن میں لے ہمدم

کہاں نکلتی ہے جانِ نزار غربت میں

نسیمِ صبح اُٹھا کر وطن کو لے جانا

خراب ہو نہ ہمارا غُبار غربت میں

وطن کا یار کبھی کوئی شاید آ نکلے

ہیں کب سے بیٹھے سرِ رہگذار غربت میں

کہاں وہ بزمِ رفیقاں، وہ محفلِ یاراں

حواس کو بھی ہوا انتشار غربت میں

جو تیغِ حُبِّ وطن سے وطن میں کھائے تھے

ہوئے ہیں زخم وہی آشکار غربت میں

وطن تجھے بھی ہمارا ہے درد؟ سچ کہنا
ہیں تیرے غم میں تو ہم سوگوار غربت میں

نسیم! کون کرے اپنی قاصدی تجھ بن
ہے صبح و شام ترا انتظار غربت میں

پیامِ مرگ ہمارا وطن میں دے دینا
نہیں ہے زیست کا کچھ اعتبار غربت میں

غزل

خزاں کا رنگ ہے خاکِ وطن! تیری بہاروں میں
ہجومِ داغِ حسرت دیکھتا ہوں لالہ زاروں میں

اُداسی تیرے کُملائے ہوئے پھولوں کی ملتی ہے
چراغِ صبح میں یا آخرِ شب کے ستاروں میں

صدائے گریہ دھیمی دھیمی اب راتوں کو آتی ہے
گئے وہ دن کہ تھا جوشِ ترنّم آبشاروں میں

نشاط انگیز اب ساون کی جھڑیاں ہو نہیں سکتیں
کہ عالم تیرِ باراں کا ہے، بارش کی پھواروں میں

یہی عالم رہا گر تیرے ضبطِ سوزِ پنہاں کا
تو پھوٹیں گے بجائے غنچہ شعلے شاخساروں میں

تڑپ کر سنگریزوں سے شرر باہر نکل آئیں
جو تیرا اضطرارِ دل بیاں ہو کوہساروں میں

غم آلودہ نہ ہوں اشعارِ محرومِ حزیں کیوں کر
کہ ہے تاثیرِ غمِ خاکِ وطن تیرے نظاروں میں

لالہ لاجپت رائے

لالہ جی کے امریکہ چلے جانے پر

اے لاجپت فدائے وطن، دردمندِ قوم
آئی نہ راس اپنے وطن کی ہوا تجھے
لوحِ زماں پہ نقش ہیں قربانیاں تری
فخرِ جہاں سمجھتے ہیں اہلِ وفا تجھے
پردیس میں مقام ترا چشمِ اہلِ دل
اپنے وطن میں گوشۂ زنداں ملا تجھے
پردیس میں تو مسندِ عزت پہ جلوہ گر
پاتے ہیں اپنے گھر میں اسیرِ بلا تجھے

محرومؔ کی طرح ہے ہزاروں کی یہ دعا
ان دلگدازیوں کا صلہ دے خدا تجھے

سوزِ وطن

لالہ لاجپت رائے کی بیماری پر

سوزِ وطن نے صورتِ تپ اختیار کی
زنداں میں بند جب وہ محبِّ وطن ہوا
دل کی بھڑاس جب نہ زباں سے نکل سکی
سوزِ نہاں سے وقفِ تب و تاب تن ہوا

دُعا

شہیدِ وطن لالہ لاجپت رائے ۱۹۲۲ء میں بعارضہ تپ بیمار ہو گئے یہ شعر اُس وقت موزوں ہوئے۔

پھر چارہ گرِ وطن کو یارب — صحت گہِ غیب سے شفا دے
ہیں منتظرِ ظہورِ رحمت — رحمت کا کرشمہ پھر دکھا دے
نیسانِ کرم ہے ذات تیری — چھینٹا کوئی آبِ زیست کا دے
دے اس کو شفا کہ پا کے صحت — مرتی ہوئی قوم کو جِلا دے
خود قیدِ فرنگ سے ہو آزاد — قیدِ غم سے ہمیں چھُڑا دے
وہ یوسفِ مصرِ جانِ ملت — پنجاب کے تفرقے مٹا دے
آوارۂ دشتِ گمرہی کو — آ کر رہِ راست پر لگا دے
وہ قافلۂ وطن کا سالار — منزل کا ہمیں پتہ بتا دے
فریادِ جرس صدا ہے جس کی — بھُولے بھٹکوں کو پھر ملا دے
اک بار بہ فیضِ حُسنِ تدبیر — بگڑے ہوئے کام پھر بنا دے

وہ عزتِ ہند کا نگہباں
پھر ہند کو واپس اے خدا دے

تاثیرِ بے گناہی

لالہ لاجپت رائے کی رہائی پر لاہور کے جلسۂ عام میں پڑھی گئی

ہو رہے ہیں آج کیوں عشرت کے سامان ہر طرف
جشنِ جمشیدی کے جلوے ہیں نمایاں ہر طرف

آ رہا واپس ہے کوئی رام کیا بن باس سے
ضو فگن بھارت میں ہے نورِ چراغاں ہر طرف

کس کے قدموں میں یہ آنکھیں بچھ رہی ہیں چار سُو
اُگ پڑے خاکِ وطن سے نرگستاں ہر طرف

بُلبلِ خوش نوا کوئی یہاں آنے کو ہے
آج ویرانوں میں ہے رنگِ گُلستاں ہر طرف

آمد آمد آج کس گل کی ہے اے اہلِ چمن!
آسماں پر چھا گیا ابرِ بہاراں ہر طرف

ہو رہی ہیں کس کے استقبال کی تیاریاں
منتظر کس کے کھڑے ہیں سرو ریحاں ہر طرف
پھوٹی پڑتی ہے مسرت، جوش پر ہے انبساط
ہند کے پیر و جواں ہیں آج فرحاں ہر طرف
ماہِ کنعاں آج کنعاں میں ہوا ہے جلوہ گر
حسرتِ دیدار کے نکلیں گے ارماں ہر طرف
ہیں در و دیوار روشن دیپ مالا بھی نہیں
یہ اُجالا چاند سُورج کا اُجالا بھی نہیں
مژدہ اے لاہور اے پنجاب، اے ہندوستاں
آسماں قسمت سے تم پر ہو گیا ہے مہرباں
وہ تمھارا چاہنے والا تمھیں پھر مل گیا
جس کی فرقت میں تمھارے لب پہ تھی آہ و فغاں
وہ تمھارا عاشقِ شیدا، تمھارا جاں نثار
جو تمھارے غم میں نکلا چھوڑ کر سب خانماں
جو سُناتا پھرتا تھا حسرت بھری آواز میں
غیر ملکوں میں تمھارے درد و غم کی داستاں

کیوں ہمارے باغ میں بیگانہ وش ہے اے صبا
آگیا پھر وہ اُمیدوں کے چمن کا باغباں

ہوکرم فرما ادھر بھی، کس طرف ہے لے بہار
چھ مہینے ہوگئے، اب دُور اے دَورِ خزاں

آگیا اے قوم، وہ کشتی کا کھیوا آگیا
کوئی دم میں پار ہے بیڑا ہمارا، اے جہاں

لاجپت رائے وہ تیرا تجھ کو واپس مل گیا
مانڈلے سے جھیل کر آیا ہے لاکھوں سختیاں

جاگ اے بھارت، ترے پہلو میں ہے پیارا ترا
سامنے آنکھوں کے ہے وہ آنکھ کا تارا ترا

جب کہ پہنچی ہند میں تیری رہائی کی خبر
قیدِ غم سے ہوگیا آزاد ہر فردِ بشر

ہوگئی وہ صبح، صبحِ عید ملکِ ہند میں
مژدۂ آمد ترا لے آئی جب بادِ سحر

کون لایا تجھ کو واپس ہند میں اے لاجپت
اپنی آہیں نارسا اور اپنے نالے بے اثر

پار ہے ساتوں سمندر کے وہ دربارِ شہی
قیصرِ کسریٰ عدالت جس میں ہے خود جلوہ گر
دُور ہے ہندوستاں سے کس قدر وہ باغِ داد
مار سکتا ہے وہاں بھارت کا پنچھی جا کے پَر؟
جذبۂ اُلفت ہمارا کھینچ کر لایا تجھے
آہ! پر آئی کہاں سے اس میں طاقت اس قدر
تیری معصومی تجھے لائی یہاں لے لاجپت
تجھ کو تیری بیگناہی نے چھڑایا سر بسر
حاش للہ، تُو نہ تھا باغی، یہ سب تھا افترا
جُرمِ حُبِّ قوم کا بیشک تُو ملزم تھا مگر
حالی و قالی بہت ہیں یوں تو شیدائے وطن
شعرِ حالی صادق آیا ایک تیرے حال پر
"جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و در شوقِ پیکاں زیستن"
آسماں تھا جن دنوں ہندوستاں پر خشمگیں
بیدآسا کانپتی تھی کانگڑے کی سرزمیں

تھی جہاں بستی، وہاں شہرِ خموشاں بس گیا
ہو گئے مٹی میں مٹی کیا مکاں اور کیا مکیں

آہ! لاکھوں گلبدن جب ہو گئے پس کر غبار
مسکنِ ماہی تلک پہنچے ہزاروں مہ جبیں

بچ گئے تھے جو بچارے، تھے وہ مُردوں سے بتر
آسماں کھینچے ہوئے سر پر کھڑا تھا تیغِ کیں

بھوک سے بیتاب کچھ، کچھ تو دہائے خاک میں
کچھ مرے، کچھ نیم بسمل اور مرنے کے قریں

تجھ سے یہ حالت نہ اپنے ملک کی دیکھی گئی
ہو گیا تیار خدمت کے لئے ڈٹ کر وہیں

سچ کہا ہے کہنے والے[1] نے کہ پہلو میں ترے
دل کے دو پہلو ہیں، اک ہے موم کا، اک آہنیں

موم کے پہلو میں جب تیرِ غمِ اہلِ وطن
آ کے لگتا ہے تو ہو جاتا ہے تو اندوہگیں

دوسرا پہلو جو لوہے کا بنا ہے، سخت ہے
سختیِ ایام کا جس پر اثر ہوتا نہیں

[1] ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ ایم اے

لاجپت رائے تو بیشک آبرُو ہے قوم کی
مُدّعا تو قوم کا ہے، آرزُو ہے قوم کی

ملک پر نازل ہوا جب قحط سالی کا عذاب
اے خدا ہندوستاں پر پھر نہ آئے یہ عتاب
خاص کر تھا راجپوتانہ گرفتارِ بلا
خلق نکلی گھر سے ہو کر خستہ و زار و خراب
اس مصیبت پر بہائے اک جہاں نے اشکِ خوں
سنگدل کوئی نہ رویا گر تو بس وہ تھا سحاب
راجپوتوں کے دُلارے، ہائے وہ نازوں پلے
مانگتے تھے بھیک، لیکن صاف ملتا تھا جواب
پیتے تھے خونِ جگر پانی کے بدلے آہ آہ
کھاتے تھے روٹی کے ٹکڑے کے عوض پیچ و تاب
پائے عریاں ہیں وہ چھالے تن پہ وہ گردِ سفر
مارے مارے پھرتے تھے بے آب و نان بے خور و خواب
تو نے ایسے میں غریبوں کو بچایا، لاجپت
تو ہی ان سر بازدوں پر بن کے چمکا آفتاب

دل دیا ہے دردمند ایسا تجھے اللہ نے

روزِ اوّل جو کروڑوں میں ہوا تھا انتخاب

آج کل بھی قحط کا ہر چند خدشہ کم نہیں!

تو یہاں موجود ہے اے لاجپت کچھ غم نہیں

ہم نہ ہوں گے دہر میں او ہستیٔ ناپائدار

ورنہ گلزارِ وطن کی تجھ کو دکھلاتے بہار

نکہتِ گلہائے آزادی کی اُڑ اُڑ کر مہک

جائے گی ہندوستاں سے سُوئے چیں سُوئے تتار

آئے گی بادِ سحر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی!

بن سنور کر سیر کو جیسے کوئی نکلے نگار

سبزۂ بیگانہ سے اُٹھ جائے گی بیگانگی!

ساحلِ جوئے چمن سے خوب ہوگا ہمکنار

سینۂ اہلِ چمن سے کینہ ہو جائے گا دُور

دل میں پھولوں کے نہ دیکھے گا کوئی ہرگز غبار

دخل کیوں ہوگا خزاں کا گلشنِ شاداب میں

جب کہ پہرے پر کھڑے ہو جائیں گے سرو و چنار

خوب ہی دکھلائے گی خاکِ وطن گلریزیاں

خوں شہیدانِ وطن کا جب کہ ہوگا آشکار

یہ ہمارا عہد جب ہو جائے گا عہدِ کہن

گُل کھلائے گی نئے جب گردشِ لیل و نہار

ثبت ہوگا برگ و گُل پر لاجپت رائے کا نام

اور گائے گی پُرانے گیت گلشن میں ہزار

ہم[1] نہ ہوں گے، ہم نہ ہوں گے آہ اے چشمِ خیال

کچھ نظر آتی ہے تجھ کو گردشِ دوراں کی چال؟

[1] پوری نصف صدی (۱۹۶۵ء میں)، بیت چکی ہے۔ اُس وقت واقعی اس نظم کے مصنف کو توقع نہ تھی کہ اُس کی حین حیات میں غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن جیسا کہ اس نظم کے اس بند سے ظاہر ہے۔ اُمید اپنی جھلکیاں دکھا رہی تھی۔

غزل

یہ قفس اور اس میں یُوں افسردہ و ناشاد ہم
خانہ پرورد چمن ہیں آخر اے صیّاد ہم

پھر بہار آئی، ہوئے پھر مائلِ فریاد ہم
کرتے ہیں کنجِ قفس میں آشیاں کو یاد ہم

رشکِ جنّت فصلِ گُل میں ہیں فضائیں دہر کی
اور قفس میں مضطرب ہیں آشیاں برباد ہم

ہم صفیرانِ چمن سے جا کے کہنا اے صبا!
میہماں ہیں کوئی دم کے کُشتۂ بیداد ہم

یادِ نسرین و سمن سے دل ہیں لاکھوں داغ ہیں
مثلِ محرومِ حزیں غربت میں ہیں ناشاد ہم

ترانۂ مسرت

شکر صد شکر، ہو گئے آزاد — لاجپت رائے، جوہر[1] و کچلو[2]

ملک بھر میں یہ مژدہ پھیل گیا — جیسے فصلِ بہار میں خوشبو

دردمندانِ قوم ہیں دلشاد — عالمِ انبساط ہے ہر سُو

آ گئے پھر شمیم کے جھونکے — جا چکی فتنہ و فساد کی بُو

عوضِ خار زار دیکھیں گے — گل و ریحان و لالہ و شبّو

بُوم و زاغ و زغن کا دَور گیا — سنیے بلبل کا نغمۂ دلجو

رفع ہو جائیں گے نزاع تمام — اب رہے گی نہ مَیں مَیں اور تُو تُو

وقت وہ آ گیا قریب کہ جب — گلے مل جائیں مسلم و ہندو

پھر وہی جد و جہد ہو جاری
رکھ کے ہر اختلاف کو اک سُو

[1] مولانا محمد علی جوہر [2] ڈاکٹر سیف الدین کچلو

ڈائر اور نادِر

دونوں کے قتلِ عام کا مقابلہ

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک
سفّاک اُس کا نام ہے مشہور آج تک
ہے آج تک وہ سانحہ غارت گرِ سکوں
تاریخِ ملکِ ہند بہاتی ہے اشکِ خوں
لیکن ہے جورِ نادرِ سفّاک سے سوا
ڈائر کے قتلِ عام کا پُر ہول ماجرا

اُس نے کیا تھا قتل رعایائے غیر کو
جو ہو چکی تھی جنگ میں خود اُس کے رُوبرو
جس سے ذرا بھی اُس کو اُمیدِ وفا نہ تھی
جو قوم ابھی تھی زندہ، شہیدِ جفا نہ تھی!

ڈائر نے قتلِ عام کیا اُس مقام پر!
مرتے جہاں ہیں لوگ، اطاعت کے نام پر
جن کی وفا کے گیت ڈوائر نے گائے ہیں
برطانیہ کے کام بُرے وقت آئے ہیں
یورپ لہو سے جن کی ابھی لالہ زار ہے
اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے

—

اُن کے ہی بھائی بند تھے اُس باغ میں جہاں
ساون کے بادلوں کی طرح برسیں گولیاں
شامل تھے اُن میں پیر بھی اور خورد سال بھی
دل میں کسی کے تھا نہ خطر کا خیال بھی
میلہ سمجھ کے باغ میں داخل ہوا کوئی
جمگھٹ عجیب جان کے شامل ہوا کوئی
نکلا تھا کوئی لوٹنے لطفِ بہار کو
آغوش میں لئے تھا کوئی شیر خوار کو

تھی درمیانِ باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ
ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ
پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جاں
پتھّر کا دل بناؤں تو کچھ ہو سکے بیاں
ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا
لوہُو سے لال دامنِ برطانیا کیا

غزل

تیرا خُوں ہونا دلِ حسرت نشاں دیکھا کئے — منظرِ خونین چشمِ خُوں فشاں دیکھا کئے
دودِ آہِ دردمندانِ وطن سے ہر سحر — آسماں اک اور زیرِ آسماں دیکھا کئے
اُن سے رُو گرداں رہی تُو اور یونہی اہلِ چمن — راہ تیری اے بہارِ بے خزاں دیکھا کئے
نغمہ آرائی سے کیا ہم کو کہ فصلِ گُل میں بھی — بجلیوں کی زد میں شاخِ آشیاں دیکھا کئے

اِس جہاں میں شادؔ اے محروم کیا ہوتے کہ ہم
عُمر بھر بربادیِ ہندوستاں دیکھا کئے

مناظرہ

شیخ سعدیؒ اور اوڈوائر

اوڈوائر سے یہ سعدیؒ نے کہا
کشورِ پنجاب کے فرماں روا

دل میں کچھ اپنے خدا کا خوف کر
اس قدر زعمِ حکومت میں نہ آ

بے خطاؤں پر نہ ڈھا جور و ستم!
رکھ روا ان پر نہ جورِ ناروا

گر نہیں خوفِ خدا کا کچھ اثر
(نام کو ہے اِن دنوں خوفِ خدا)

کب کرے گا صاد ان اعمال پر
تاجدارِ کشورِ برطانیا

ذبح کر ان کو نہ باغی جان کر
باوفا ہیں، باوفا ہیں، باوفا!

نامِ شاہنشاہ پر مرتے ہیں یہ
جنگِ یورپ نے یہ ثابت کر دیا

ان سے بڑھ کر باوفا کوئی نہیں
تو نے جلسوں میں کہا ہے بارہا

بم کے گولوں کے عوض پنجاب میں
چاہیئے آنسو ندامت کے گرا

تاقیامت بس وہ کافی ہے تجھے
جلیانوالے میں جو کچھ تو نے کیا

مائلِ لطف و کرم حاکم رہے
حکمرانی کا اسی میں ہے مزا

سلطنت کے قصرِ عالی شان کی
چاہیئے عدل و نکوئی پر بِنا

کیا گلستاں میں نظر آیا نہیں
حق میں ظالم کے جو کچھ میں نے کہا

"ظالمے را خفتہ دیدم نیم روز
گفتم ایں فتنہ است خوابش بُردہ بہ
آنکہ خوابش بہتر از بیداری است
آنچناں بد زندگانی مُردہ بہ"

اوڈوائر نے دیا فوراً جواب
ناصحِ شاہانِ پیشیں سعدیا!

کس طرح تو آگیا پنجاب میں
بند ہے یاں ناصحوں کا داخلہ

اینڈریوز اور نارٹن اہلِ فرنگ
تو یکے از ساکنانِ ایشیا

وہ تو ہوں پابند میرے حکم کے
تو یہاں پھرتا رہے مثلِ ہوا

تجھ کو پاتا کاش قیدِ جسم میں
پھر نصیحت کا چکھا دیتا مزا

خیر تجھ سے بھی سمجھ لوں گا کبھی
عالمِ ارواح میں جب آؤں گا

جو ہوا پنجاب والوں سے سلوک
مستحق اس کے ہی تھے یہ نا سزا

ڈالتے تھے نیند میں میری خلل!
کرکے جلسوں میں بہت آہ و بکا

رہنما بیدار کرتے تھے انھیں
چاہتا تھا میں کہ سوجائیں ذرا

اُن کے ہی آرام کا طالب تھا میں — خواب بیداری سے ہے راحت فزا

حق طلب کرتے تھے یہ سرکار سے — چھاپ کر اخبارِ حق میں نے دیا

جنگِ یورپ میں جو تھے جا کر لڑے — اُن کو اسنادِ طلائی کیں عطا

سرفرازی ہے رعایا کی یہی — سر نہ ہو پائے حکومت سے جُدا

ورنہ بم ہے، توپ ہے، بندوق ہے — تیرے وقتوں میں بھی یہ ساماں تھے کیا

کرتے تھے تیری نصائح پر عمل! — خسروانِ عہدِ پیشیں، سعدیا!

کوئی ساماں پاس وہ رکھتے نہ تھے — کارگر لطف و عنایت کے سوا

ورنہ کیا تاب و تواں محکوم میں — پیشِ حاکم کر سکے چون و چرا

دیکھ میں نے کر دیا ثابت اسے — جو کبھی تو نے گلستاں میں کہا

"ہر کہ با بولاد بازو پنجہ کرد
ساعدِ سیمینِ خود را رنجہ کرد"

پنجاب اور دہلی کے واقعات پر

شاعر کا فرض ہے اُسے دیکھے بچشمِ غور
دنیا میں اُس کے سامنے جو کچھ ہو رُونما
ہو کر اثر پذیر، کرے نظم میں بیان
کچھ اس طرح کہ کھینچ دے تصویر ماجرا
دل تھا اِسی خیال میں میرا کہ غیب سے
آئی بگوشِ ہوش یہ حسرت بھری صدا
جو واقعات دہلی و پنجاب میں ہوئے
محروم اُن پہ نظم نہ لکھ اشکِ خوں بہا!

صبحِ وطن

وہ تازگی، وہ جلوہ نمائی نہیں رہی
طلعت میں تری روح فزائی نہیں رہی
زیبائی نہیں، ہوش رُبائی نہیں رہی
اے صبحِ وطن تجھ میں صفائی نہیں رہی

حیرت کے سبب آئینہ سیما ہے تو کیا ہے
آلودۂ گردِ غمِ دل تیری فضا ہے

خورشید یہ داغِ دلِ سوزاں کا ہے دھوکا
یا شعلۂ آہِ شرر افشاں کا ہے دھوکا
یا شمعِ سرِ گورِ غریباں کا ہے دھوکا
یا اخگرِ سوزِ غمِ پنہاں کا ہے دھوکا

شبنم پہ تری اشکِ چکیدہ کا گماں ہے
یہ گنبدِ نیلی ہے کہ آہوں کا دُھواں ہے؟

سُرخیِ شفق ہے کہ تمناؤں کا خوں ہے
یا وقفِ نمائش یہ ترا داغِ جنوں ہے

ہر ایک پھریرا تری کرنوں کا نگوں ہے
نظارہ جو ہے مظہرِ احوالِ زبوں ہے
نغمے جو تھے نالے ہوئے مرغانِ سحر کے
جو پھول کھلے، زخم ہوئے تن پہ شجر کے

اے صبحِ وطن! کیوں نہ ہو تو یاس کی تصویر
غمدیدہ و افسردہ و رنجیدہ و دلگیر
احرارِ وطن سب ہیں تہِ خنجرِ تعذیر
زنداں سے گیا تا بہ فلک نالۂ زنجیر

یہ درد ہے خود تیرے رُخِ زرد سے پیدا
وحشت ہے ترے چاکِ گریباں سے ہویدا
اے کاش کبھی ہند میں وہ دور بھی آئے
جب صبحِ وطن جلوۂ جانانہ دکھائے

آزادیِ ابنائے وطن رنگ جمائے
زنداں میں یہ جذبہ نہ سمائے، نہ سمائے
یارب! اثرے بخش دعائے سحرم را
مائل بہ کرم کن دلِ اربابِ ستم را

شامِ وطن

محبّانِ وطن کے قید ہو جانے پر

کیا ہو گیا ایّامِ مسرّت کو الٰہی؟
شامِ طربِ ہند کدھر ہو گئی راہی
ہو جس سے عیاں تیرگیِ دورِ تباہی
اے شامِ وطن ایسی ہے کچھ تیری سیاہی
ہے باعثِ غم گیسوئے برہم کا نظارا
پیدا تری صورت سے ہے ماتم کا نظارا

اے شامِ وطن تجھ پہ برستی ہے اُداسی

ہر سمت ہے چھائی ہوئی حسرت کی گھٹا سی

رہ رہ کے صدا آتی ہے کچھ آہ و بکا سی

ٹھنڈی تری سانسیں ہیں کہ چلتی ہے ہوا سی

بدلی ہوئی کس درجہ ہے صورت تری افسوس

کیا ہو گئی وہ موہنی مورت تری افسوس

ہوتا ہے گماں مجھ کو یہ سرخیِ شفق پر!

روتا ہے کوئی خوں ترے اندوہ و قلق پر

اک آگ سی جلتی نظر آتی ہے اُفق پر

یا خون کی تحریر ہے گردوں کے ورق پر

رنج و الم و حسرت و افسوس و الم کا

طوفاں ہے تری محفلِ خاموش میں برپا

اے شامِ وطن کیوں نہ ہو تو پیکرِ حرماں

رونق تھی تری جن سے وہ لُٹ سب گئے ساماں

جن شمعوں سے روشن تھی کبھی تیری شبستاں

اب ان کو مقدر نے دیا گوشۂ زنداں

اِس دور میں کیوں درخورِ محفل نہ رہیں وہ
زنداں ہی میں جل بجھ کے نہ رہ جائیں کہیں وہ
پھر ہند میں آئیں کبھی ایّامِ مسرت
تمہیدِ شبِ قدر ہو ہر شامِ سعادت
اس دَور میں ہے جو کہ نمک پاشِ جراحت
تسکینِ دلِ زار ہو پھر تیری ملاحت
اک صبح نسیمِ سحری یوں ہو پیامی
"لو ٹوٹ گیا حلقۂ زنجیرِ غلامی"!

تاکجا؟

یہ خود فراموشی کہ ہے مانندِ خودکُشی
اے ساکنانِ خطّۂ پنجاب تاکجا؟

کیوں رہبرانِ قوم نے آخر لیا ہے جوگ
دل میں تمھارے ذوقِ خور و خواب تاکجا؟

زنداں میں خاک پر ہے سرِ افتخارِ قوم
سودائے خامِ بالشِ سنجاب تاکجا؟

عنّاب گوں ہے خاک ابھی جلیانوالے کی
اے بادہ کش یہ شغلِ مئے ناب تاکجا؟

حالِ تباہِ قوم کا چرچا ہوا ہے عام
آنسو بنیں گے گوھرِ نایاب تاکجا؟

انجام خود سکوں ہے ہر اک اضطراب کا
تسکیں کو روئے گا دلِ بے تاب تاکجا؟

نوجوانوں سے خطاب

نوجوانانِ کشورِ پنجاب | نونہالانِ گلشنِ شاداب
ذلتِ مادرِ وطن پر تم | جائے حیرت ہے یوں رہو گم سُم
جوش آئے نہ خونِ غیرت میں | بے حسی ہو رگِ حمیت میں
تم کو آخر یہ ہو گیا کیا ہے؟ | "آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟"
مارشل لا کو بھول بیٹھے ہو؟ | جھوٹے وعدوں پہ پھول بیٹھے ہو؟
کیا نہیں جورِ اوڈوائر[1] یاد؟ | یا نہیں قتلِ عام ڈائر[2] یاد؟
جانسن[3] کے وہ پُر عتاب احکام | اوبرائن[4] کی زشتیِ دشنام

بے حیائی سمتھ[5] کی یاد کرو
کیوں نہ کچھ اس کا انسداد کرو

---

[1] پنجاب کا سخت گیر لفٹننٹ گورنر [2] مشہور بدنام جنرل جس نے جلیانوالے میں قتل عام کیا
[3] امرتسر میں مارشل لا کا حاکمِ اعلیٰ [4] اور [5] دو بدنام ڈپٹی کمشنر

خیر مقدم

(پنجاب میں اوڈوائر اور ڈائر کے کارناموں کے بعد)

بعدِ شبِ تارہ صبحِ خنداں
جس طرح اُفق پہ ہو نمایاں
یا بعدِ فسردگیِ سرما!
ہو فصلِ بہار جلوہ فرما
یا موسمِ پُرخروش کے بعد
طوفانِ بلا کے جوش کے بعد
عالم ہو سکوت کا فضا میں
تُندی نہ ہو نام کو ہوا میں
اس طرح ہوا ہے جلوہ افگن
پنجاب میں عہدِ میکلیگن

تازیانہ

سجا ہے تجھ کو سودا ہے اگر آرائشِ تن کا
خزاں جس میں نہ آئے، پھول ہے تو ایسے گلشن کا
رہا کر، ہاں رہا کر تو نگہباں اپنے جوبن کا
تباہی پر وطن کی دل ہو میلا تیرے دشمن کا

نہیں بیجا اگر گاڑھے سے تیرے دل کو نفرت ہے
اُٹھا سکتی کہاں اس کو تری شانِ رعونت ہے

محبانِ وطن بے خانماں ہیں تجھ کو کیا پروا
گرفتارِ بلائے ناگہاں ہیں تجھ کو کیا پروا
قفس میں بلبلانِ نغمہ خواں ہیں تجھ کو کیا پڑا
ترے سرو و سمن وقفِ خزاں ہیں تجھ کو کیا پڑا

تجھے کیا گر شہیدِ خنجرِ بیداد ہے کوئی
تجھے افسوس کیوں آئے، اگر ناشاد ہے کوئی

مصیبت میں ہزاروں خانداں ہیں اور تو بے غم
ترے اہلِ وطن محوِ فغاں ہیں اور تو بے غم

وطن کے حال پر سب نوحہ خواں ہیں اور تُو بے غم
تزلزل میں زمین و آسماں ہیں، اور تُو بے غم

نکل کر گھر سے جائے تا درِ زنداں بَلا تیری
ہو جوشِ نالۂ زنجیر سے گریاں بَلا تیری

تجھے تن تن کے چلنا زیب دیتا ہے، یُونہی چل تُو!
ترے اہلِ وطن رینگے، نہ رینگا پیٹ کے بَل تُو

جہاں کو اپنی رعنائی دکھا، اور خوب کَس بَل تُو
ہُوا کیا جلیا نُوالے ہیں؟ کہ ہو بے وجہ بے کَل تُو

زبردستی جو چہروں سے نقاب اُلٹے گئے تو کیا
خزاں میں دفترِ گُل بے حساب اُلٹے گئے تو کیا

تجھے طوقِ غلامی سے جو عار آئے تو کیوں آئے
جو دل میں حسرتِ قومی وقار آئے تو کیوں آئے

سکونِ قلب میں گر انتشار آئے تو کیوں آئے
خیالِ گردشِ لیل و نہار آئے تو کیوں آئے

تجھے معلوم کیا، قومی حمیّت کِس کو کہتے ہیں!
یہ غیرت مند کیا ہیں اور غیرت کِس کو کہتے ہیں!

فغاں کیے جاؤ

عیاں اثر کبھی ہوگا، فغاں کیے جاؤ
فغاں میں دل کی تمنّا بیاں کیے جاؤ

صدائے نالہ سے اہلِ زمیں کو تڑپا دو
بپا نہ ہلکہ تہِ آسماں کیے جاؤ

سنائے جاؤ زمانے کو غم بھری رُوداد
بزورِ شکوۂ دورِ زماں کیے جاؤ

اُٹھائے جاؤ، فلک سے جو آپڑے اُفتاد
اِسی میں سود ہے، اپنا زیاں کیے جاؤ

قرارِ عرش پہ بھی ہو نہ رُوحِ ڈائر کو
بلند شعلۂ سوزِ نہاں کیے جاؤ

دعائیں دیتے چلو جانِ اوڈوائر کو
ستم جو ڈھائے ہیں اُس نے بیاں کیے جاؤ

یہی ہے شرطِ حمیّت کہ اپنے آپ کو تم
نثارِ خدمتِ ہندوستاں کیے جاؤ

خاکِ ہند

اے خاکِ پاکِ ہند! ہم اوجِ فلک ہے تُو
اِس تیرگی پہ سُرمۂ چشمِ ملک ہے تُو
انوارِ معرفت کی دکھاتی جھلک ہے تُو
یعنی امینِ رازِ ازل آج تک ہے تُو
گو عہدِ اوّلیں کی طرح اب نہیں ہے تُو
عالم میں پھر بھی کعبۂ جاپان وچیں ہے تُو
کچھ رازِ ہست ونیست کھُلا تو کھُلا یہیں
عقدے فنا بقا کے ہوئے آکے وا یہیں
بیتابیٔ نہاں کی ہوئی ابتدا یہیں
تسکینِ رُوح کی ہوئی پیدا فضا یہیں
پہنچے یہیں کے خاک نشیں آسماں تلک!
پھینکا کمندِ فکرِ رسا آسماں تلک!

وادی جہاں تری ہے وہ ایمن حریم ہے
ہر کوہ پر حکایتِ طُور و کلیم ہے
ہر ذرّہ تیرا مظہرِ حُسنِ قدیم ہے
تُو جلوہ گاہِ رحمتِ ربِّ کریم ہے

آتی ہے آہ! تیری ہواؤں سے بُوئے خُلد!
ہو زندگی یہاں کی تو کیا آرزوئے خُلد!
پیدا ہے تیرے سبزہ و گُل سے بہارِ خُلد!
کرتے نہیں ہیں تیرے مکیں انتظارِ خُلد
لیل و نہارِ ہند ہیں لیل و نہارِ خُلد
طالب جو ہے ترا نہیں منّت گزارِ خُلد

ہر چند وہ سماں نہیں اور وہ نہیں ہے تُو
پھر بھی زمیں پہ رشکِ بہشتِ بریں ہے تُو
دو گُل شگفتہ ہیں ترے گلشن میں عقل و عشق
کھلتے ہیں اپنے قُدرتی جوبن میں عقل و عشق
رہتے ہیں مل کے ایک نشیمن میں عقل و عشق
پاتے ہیں پرورش ترے دامن میں عقل و عشق

صہبائے بے خودی بھی ہے، جوشِ عمل بھی ہے
ذوقِ عیاں بھی، خامشیِ بے خلل بھی ہے
تہذیب تیری چشمِ جہاں میں سما گئی
تعلیم تیری جور و ستم کو مٹا گئی
تقلید تیری دہر کو جنّت بنا گئی
تا ساحلِ عرب تری ٹھنڈی ہوا گئی
ہر ذرّہ ہے ترا وہ ضیا بارِ فلسفہ
یونان تلک گئے ترے انوارِ فلسفہ
تو آج مٹ مٹا کے بھی ہے فخرِ روزگار
بس چل سکا نہ گردشِ دوراں کا زینہار
دَورِ زماں سے مٹ نہیں سکتی تری بہار
ہر داغِ دل ہے پھول کی صورت میں آشکار
بدخواہ گو ہے صدیوں سے چرخِ کہن ترا
پھر بھی اُجڑ اُجڑ کے ہرا ہے چمن ترا

اگلے ہندو

بہت نیکدل تھے، بہت نیک خُو تھے　　جری تھے، بہادر تھے، پُر صُلح جُو تھے
وطن کے لئے فخر تھے، آبرو تھے　　تھے گلشنِ ہند رنگ اور بُو تھے
گلوں سے ہے جس طرح رونق چمن کی
یُونہی اُن کے دم سے تھی زینت وطن کی

وطن پر وہ تھے جاں فدا کرنے والے　　نہ تھے جاں کی پروا ذرا کرنے والے
نہ تھے جنگ میں ابتدا کرنے والے　　مگر بعد میں انتہا کرنے والے
کبھی اُن کو میدان سے ٹلتے نہ دیکھا
کہ پائے عزیمت پھسلتے نہ دیکھا

جو ہوتی تھی رن میں شرر بار ہندی　　تو کرتی تھی دشمن کو فی النّار ہندی
دکھاتی تھی محشر کے آثار ہندی　　سُنا ہے کہ تھی سخت خونخوار ہندی

گئے مان یونان کے مستر دلو ہا
نہ تھا تیغِ ہندی کا یوں سستر دلو ہا

نہ رکھتے تھے وہ کین و پیکار باہم　　نہ کاوش، نہ جھگڑا نہ تکرار باہم
ملے جب کبھی یار و اغیار باہم　　رہا بھائیوں کی طرح پیار باہم

عدالت میں جانے سے نفرت تھی اُن کو
کہ اک دوسرے سے محبّت تھی اُن کو

عدالت میں وہ کس لئے بھاگے جاتے　　بھلا کس لئے جھوٹے شاہد بناتے
وہ کیوں گالیاں اہلِ قانوں کی کھاتے　　عبث کس لئے اپنی عزّت گنواتے

بنا دھرم پر اُن کے بیوہار کی تھی؛
ہر اک کام میں رہنما ستی تھی؛

اہنسا کے پابند، دھرماتما تھے　　صداقت کے پُتلے تھے اور بے ریا تھے
بتاتی ہے دنیا کہ وہ لوگ کیا تھے　　بظاہر بشر، اصل میں دیوتا تھے

اُنہی کی ہیں لے وائے اولاد ہم بھی
زمانے میں ہیں ننگِ اجداد ہم بھی

نہ تھے رندِ رسوا نہ میخوار تھے وہ — نہ عیّاش تھے وہ، نہ بیمار تھے وہ
نہ تھے چور رہزن، نہ بدکار تھے وہ — تھے نیکو روش، نیک اطوار تھے وہ
لگاتا نہ تھا قفل کوئی دروں کو
کھلا چھوڑ جاتے تھے اپنے گھروں کو

جہاں میں تھا جس وقت دورِ غلامی — وہ آزادیٔ ہر بشر کے تھے حامی
وہاں سرفرازی، یہاں نیک نامی — رہے دونوں عالم میں یعنی گرامی
بلندی وہ اُن کی، یہ پستی ہماری
نہ ہونے سے بدتر ہے ہستی ہماری

خموش مقابلہ[1]

یہ نہیں ہے شانِ وفا صنم کہ کریں بجوش مقابلہ
تری سختیوں سے کریں گے ہم، بخدا! خموش مقابلہ
ترے پائمالِ ستم ہیں گو، مگر ان میں تاب و تواں یہ ہے
شب و روز کرتے ہیں، موت سے ترے سرفروش مقابلہ
تو جو خوں ہوا ہے تو کیا ہوا، کہ دمِ اخیر تلک کیا
غمِ بے حساب سے تو نے اے دلِ صبر کوش مقابلہ
جو ادا ہے تیغ بکف ہے وہ، جو سخن ہے خنجرِ جاں ستاں
تری فوجِ ناز سے تا کجا، کریں چشم و گوش مقابلہ
گئی جان حسرتِ دید میں، مگر اف نہ آئی زبان پر — تلک[2] اس کو کہتے ہیں ضبطِ غم، یہ ہے بے خروش مقابلہ

[1] مدافعتِ مجہول کے زمانے میں کہی گئی [2] مصنف کا تخلص (مخنف)

سائمن کمیشن

سائمن کمیشن کے ہندوستان آنے پر

ہے مشہور ہندوستاں کا نفاق
مرض ہو گیا ہے پرانا نفاق
اسی فکر میں مر گئے چارہ گر
ہے بیمار ویسے کا ویسا مگر
عجب لوگ ہیں اہلِ ہندوستاں
نہیں جانتے اپنا سود و زیاں
نہیں متفق یہ کسی بات پر
تُلے رہتے ہیں اختلافات پر
نہ لیڈر یہاں کے بہم متفق
نہ پبلک نہ اہلِ قلم متفق
کمیشن کے آنے پہ برپا ہے شور
دکھاتی ہے ہر پارٹی اپنا زور
کوئی کہہ رہا ہے کہ آ سائمن
کوئی چیختا ہے کہ جا سائمن

۱۹۲۹ء

نوحۂ سی، آر، داس

عالم نہ پوچھیے دلِ حسرت اساس کا
پیکر ہے کلفت و غم و حرمان و یاس کا

وقفِ ہزار درد ہے پھر جانِ ناتواں
پھر دل کو سامنا ہے غمِ بے قیاس کا

لے کر رہے گا کشتیٔ صبر و قرار کو
طوفاں اُٹھا ہے آج وہ بیم و ہراس کا

ظالم کو لاگ جوہرِ مردانگی سے ہے
شکوہ ہے گردشِ فلکِ ناشناس کا

ڈوبا ہے آج کوکبِ اُمّیدِ حرّیت
ماتم بپا ہے ہند میں سی، آر، داس کا

وہ فخرِ ہند، نازشِ بنگال چل بسا
قوم و وطن کو چھوڑ کے بدحال چل بسا

محبوبِ جانِ قوم، محبِّ وطن گیا
ہندوستان تمام عزاخانہ بن گیا

سوزِ غمِ فراق ملا ہم کو، اور وہ!
سُوئے بہشت چھوڑ کے دارالمحن گیا
بادِ بہار تازہ کرے گی چمن کو کیا
وہ پھول تھا جو نازشِ صحنِ چمن، گیا
آزاد تھا وہ مردِ جری اس قدر کہ ہائے
بے بس ہوا تو توڑ کے زندانِ تن گیا
جاں آگئی وطن کی لبوں پر مگر ترا
خالی نہ ایک وار بھی چرخِ کہن گیا
جس کے لئے فضائے وطن قید خانہ ہو
جز مرگ کیا رہائی کا اس کی بہانہ ہو
خوشیاں مناؤ، عیش کرو دشمنانِ ہند
رخصت ہوئی ہے داس کے ہمراہ جانِ ہند
مرنے سے اس کے پیکرِ بے جاں ہوا یہ ملک
سی، آر، داس تھا دل و جان و زبانِ ہند
جوش و خروشِ ولولۂ حریت گیا
باقی کہاں ہے طاقت و تاب و توانِ ہند

تھا میرِ کارواں وہی اور راہبر وہی
اس کے بغیر جائے کدھر کاروانِ ہند

مارا ہے سارے ہند کو مارا نہیں اُسے
اے موت! تھا وہ چارۂ دردِ نہانِ ہند

یارب عدم میں اُس کی ضرورت پڑی تھی کیا؟
پیدا وہاں بھی دو عَملِی ہوگئی تھی کیا؟

اے رہ نوردِ عالمِ بالا یہ کیا کیا؟
پستی سے قوم کو نہ نکالا، یہ کیا کیا؟

دو ایک حلقے طوقِ غلامی کے توڑ کر!
پھر اس پہ تو نے ہاتھ نہ ڈالا، یہ کیا کیا؟

تھا دوستوں کو تیری سواری کا انتظار
اُترا جنازہ زیرِ ہمالا، یہ کیا کیا!

درماندگی میں چھوڑ گیا بے کسوں کو تُو
اے سرفرازِ ہمّت والا، یہ کیا کیا؟

ڈھارس بندھا بندھا کے غریبوں کی چل بسا
سنبھلا نہ آہ بے کے سنبھالا، یہ کیا کیا؟

روپوش آخری جھلک اُمّید کی ہوئی!
چاروں طرف ہے یاس کی آندھی اُٹھی ہوئی

لرزاں تھے مدّعی تری جُرأت کے سامنے
خس تھے وہ موجِ بحرِ طبیعت کے سامنے

جیسے نوا ہو مہرِ منوّر کے روبرو
یوں حیلہ جُو تھے تیری صداقت کے سامنے

سینہ سپر ہوا نہ کوئی سرفروشِ قوم
تیری طرح ہر ایک مصیبت کے سامنے

کُہنہ فسوں طرازِ سیاست فرنگ کے
تھے طفل تیری فہم و فراست کے سامنے

دی کیا سمجھ خدا نے کہ ناز و نعم کو ہیچ
سمجھا تُو ملک و قوم کی خدمت کے سامنے

تڑپیں گے آہ! جب نہ سنیں گے صدا تری
پُر ہو گی بزمِ حُبِّ وطن میں نہ جا تری

۱۹۲۵ء

اشکِ خوں

نوحۂ وفاتِ شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے

اپنی قسمت پر بہاؤ اشکِ خوں اے اہلِ ہند
آج ٹوٹا بخیۂ زخمِ دروں اے اہلِ ہند

چارہ کار اپنے ہوئے جاتے ہیں سب پیوندِ خاک
آسماں ہے شاملِ بختِ زبوں اے اہلِ ہند

قوم میں تازہ ابھی تھا ماتمِ سی آر داس
تھی فضائے ملک اب تک نیلگوں اے اہلِ ہند

مادرِ ہندوستاں نے دل پہ کھایا اور زخم
وار کاری کر گیا پھر چرخِ دوں اے اہلِ ہند

مدتوں تڑپائے گا ہم بےکسوں کو آہ، آہ
لاجپت رائے کے دل کا یہ سکوں اے اہلِ ہند

سختیاں سہ سہ کے دَورِ آسماں کی، اگر گیا
قصرِ آزادی کا وہ سنگیں ستوں اے اہلِ ہند

دُور منزل، اور ہم آوارۂ دشتِ بلا!
اب کدھر کو جائیں گے بے رہنموں اے اہلِ ہند

شاد، اگر چاہو کہ ہو رُوحِ شہیدِ حریت
جذبۂ ایثار کو کر دو فزوں اے اہلِ ہند

عقلِ دُور اندیش آزادی دلا سکتی نہیں
چاہیئے اس دشت میں جوشِ جنوں اے اہلِ ہند

بھینٹ آزادی کی کیسے کیسے رہبر ہو گئے
بارہا جاگے نصیبے اپنے اور پھر سو گئے

مٹ گئی آخر تلک اور گوکھلے کی یادگار
ہو گیا اہلِ وطن کی آرزوؤں کا فشار

چل دیا وہ آہ جس نے بزمِ حُبِ قوم میں!
کشورِ پنجاب کا قائم رکھا عزّ و وقار

یورپ اور امریکہ میں تھی دھاک جس کے نام کی
تجھ پہ اے خاکِ وطن قرباں ہوا وہ نامدار
آہ وہ خدمتگذارِ قوم، وہ سردارِ قوم
جاں سپار و دردمند و دلنواز و دل فگار
لاجپت رائے ترا نعم البدل ممکن نہیں
دشمنِ ہندوستاں ہے گردشِ لیل و نہار
آہ! تیری موت پر جن کے جگر ٹکڑے ہوئے
اُن کو ڈھارس کون دے اے بیکسوں کے غمگسار؟
گوش بر آواز ہیں بیٹھے ہوئے تیرے رفیق
تیرے درشن کے لئے مضطر ہے چشمِ اشکبار
یاس کی تصویر ہیبت خیز ہے پیشِ نظر
مٹ مٹا کر رہ گئے اُمید کے نقش و نگار
ناؤ ہے منجدھار میں اور ناخدا کوئی نہیں
اب خدا کا آسرا ہے جو لگا دے اُس کو پار
اے کہ تیری ذات تھی جسمِ تمنائے وطن!
کچھ تسلی دے انھیں بیکل ہیں ابنائے وطن!

سو گیا تو آہ! اے شیرِ نیستانِ وطن

تھی تری اک اک گرج سرمایۂ شانِ وطن

دیکھ لیتی کامیاب اپنے ارادوں میں تجھے

منتظر اُس روز کی تھی چشمِ حیرانِ وطن

دل ترے پہلو میں دھڑکا، ہوگئی بیتاب قوم

جاں ترے قالب سے نکلی اور گئی جانِ وطن

تیرے مٹنے سے پتا منزل کا مٹ کر رہ گیا

اے نشانِ منزلِ خدمت گزارانِ وطن

آئے گی کیوں کر حرارت پھر تنِ افسردہ میں

کس سے ہاہائے گی رونق بزمِ ویرانِ وطن

کون ہوگا، جنگِ آزادی میں رہ کر پیش پیش

سر بکف تیری طرح اے مردِ میدانِ وطن

تیرے چھپنے سے اندھیری رات کا عالم ہوا

کون سی بدلی میں ہے اے ماہِ تابانِ وطن

مانڈلے سے جس طرح آیا تھا، پھر اک بار آ

تاکہ ہو جائے بہاریں پھر گلستانِ وطن

پھر چمن کا پتّہ پتّہ تہنیت خوانی کرے

محوِ استقبال ہوں پھر سرو و ریحانِ وطن

دشمنِ تاثیر ہے یہ نالۂ حسرت اثر

نوحہ خوانی، نوحہ خوانی اے دلِ غمدیدہ کر!

لالۂ خونیں جگر اپنا ہوا وقفِ خزاں!

منتظر تیرے رہے ہم اے بہارِ جاوداں

"اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کے گیت" (اقبال)

یہ ترانہ آہ! گوشِ باغباں پر ہے گراں

نغمۂ سازِ مسرّت راس کیا آئے اُنھیں

جن غریبوں کے مقدّر میں ہو فریاد و فغاں

خاک پر گرتا ہے تاجِ آبروئے ہند آج

اُٹھ گیا افسوس، ناموسِ وطن کا پاسباں

نام لیوا آرین تہذیب کا جاتا رہا

یادگارِ عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں

بیشۂ حُبِّ وطن کا شیرِ غرّاں مر گیا

باعثِ صد گونہ حسرت ہے خموشی کا سماں

لکھنے بیٹھے گر کوئی تیری جگر سوزی کا حال
یک بیک اُٹھے قلم سے اور کاغذ سے دھواں
کارنامے جس میں ہوں گے تیرے اے جانبازِ قوم
خونِ دل سے لکھی جائے گی وہ رنگیں داستاں

جو ہوا کرتا ہے انعامِ محبانِ وطن
تو نے پایا سب سے بڑھ چڑھ کر بوقتِ امتحاں

سختیاں اغیار کی، اپنوں کی بے پروائیاں
جیل خانے، ذلتیں، پابندیاں، رسوائیاں

مرنے والے! اب نہ ہو گی کچھ پریشانی تجھے
اب کوئی مجرم بنائے گا نہ زندانی تجھے
دیس سے اپنے نہ تجھ کو اب نکالے گا کوئی
دیکھنا ہو گا نہ داغِ خانہ ویرانی تجھے
اب بنا سکتا نہیں کوئی تجھے شاہی اسیر
کھینچنی ہو گی نہ اب زنجیرِ طولانی تجھے
اُڑ گیا تو توڑ کر اپنے قفس کی تیلیاں
کون پکڑے گا اب اے مرغِ گلستانی تجھے

لاٹھیوں سے اب تری تحقیر کر سکتا ہے کون

کون دے سکتا ہے اب طعنِ گراں جانی تجھے

کون ہے جو تجھ پہ اب پابندیاں عائد کرے

چھُو نہیں سکتے قوانینِ جہانبانی تجھے

ساحلِ ہندوستاں کو اب نہ ترسے گی نظر

اب نہ دُکھ دے گا دیارِ غیر کا پانی تجھے

تیرے مرنے پر نہ خوش ہوں بدسگالانِ وطن

زعم میں اپنے سمجھ کر پیکرِ فانی تجھے

زندۂ جاوید تو، پائندۂ جاوید تو

لاجپت رائے مبارک ہو یہ قربانی تجھے

زندگانی تھی تری شمعِ فروزانِ وطن

موت ہو جائے گی تیری شعلۂ جانِ وطن

سنہ ۱۹۲۸ء

بنامِ حسرت

اے عاشقِ آزادی، اے حسرتِ موہانی
اے پیکرِ بربادی، ناکامِ تن آسانی

اعزاز ترا ثابت زنداں کے گہن سے ہے
تو آج ہے بھارت میں رشکِ مہِ کنعانی

جاں بازِ وطن تجھ سا پیدا نہ ہوا ہوگا
جرأت پہ تری قرباں خود جذبۂ قربانی

یہ لعل، یہ رنگینی، اور اُس پہ یہ سنگینی
دل توڑ دیا تو نے اے ذوقِ ستم رانی

تاثیر دکھائے گی، بے سود نہ جائے گی
یہ تیری دل افگاری، یہ تیری تن افشانی

جو بزم کی زینت تھے، جو رزم کی شوکت تھے
بہتر تو نہ تھے اُن سے جو آج ہیں زندانی

اے اہلِ وطن سُننا، دل اور جگر تھامے
اُٹھتا ہے وہ زنداں سے پھر شورِ غزلخوانی

اکالی

آغاز میں

بزورِ اسلحہ جو کچھ کمالیوں نے کیا
وہ شانتِ مے سے دلاورا کالیوں نے کیا
بھڑک اُٹھے نہ وہ ظالم کے تازیانوں سے
مشتعل اُنھیں جاہل کی گالیوں نے کیا
جو زخم کھاتے ہیں، وہ سُرخ رُو ہیں صورتِ گُل
ریاضِ دہر میں ثابت اکالیوں نے کیا
یہی دلیر نو گاندھی کا مُدّعا سمجھے
کہ سر کو راہِ محبّت میں نقشِ پا سمجھے
سمجھ میں اُن کے ارادے اسی کی آئیں گے
جو سر بکف ہو، فنا کو مگر بقا سمجھے
ہو گام زن وہی اس راہِ خار پَروَر پر!
جو انتہائے مصیبت کو ابتدا سمجھے

اے ہند کے مجنّو!

اے ہند کے مجنّو! اے رہبرانِ ملّت!

قائم جہاں میں تم سے ہے عزّو شانِ ملّت

اُجڑے ہوئے چمن کے نخلِ اُمید ہو تم

قربانیوں سے اپنی زندہ شہید ہو تم

بے سُود جائیں گی کیا قربانیاں تمہاری؟

ہوگی صدا بہ صحرا آہ و فغاں تمہاری؟

تڑپا کروگے یوں ہی سوزِ غمِ وطن سے؟

اہلِ وطن رہیں گے بیگانہ اس محن سے؟

زنداں میں تم رہو گے پابستۂ سلاسل ؛
اہلِ وطن رہیں گے عیش و خوشی پہ مائل ؟
تم ہو گے چھوٹے چھوٹے دوزخ نما گھروں میں ؟
اہلِ وطن کی راتیں ہوں گی تھیٹروں میں ؟
دل، اُف، یونہی تمھارے جل کر کباب ہوں گے ؟
اُن کے لئے جو ہر دم مستِ شراب ہوں گے ؟
ہوں گے نصیب تم کو داغوں پہ داغ یوں ہی ؟
زنداں سے ہو گی باہر بزمِ فراغ یوں ہی ؟
ملبوس قاتلوں کا تم کو ملا کرے گا ؟
اہلِ وطن کے تن پر ریشم سجا کرے گا ؟
رہ جاؤ گے یونہی تم پی پی کے خون جگر کا ؟
ایذا ہی کیا ثمر ہے ایثار کے شجر کا ؟
کس کے لئے ہے؟ کیوں ہے، یہ پیچ و تاب آخر ؟
اہلِ وطن ! ہے کچھ تو اس کا جواب آخر

زندانیوں کی عید

(تحریکِ خلافت کے دوران میں کہی گئی)

دیکھ کر تجھ کو اے ہلالِ عید　　عیدِ زندانیوں کی یاد آئی
عید کیوں کر منائیں گے آخر　　وہ اسیرانِ کنجِ تنہائی
اشکِ خونیں میں جلوہ گر ہوگا　　رنگِ اظہارِ ناشکیبائی
یا کریں گے لبانِ مرغِ اسیر　　درِ زنداں سے نالہ آرائی
یا پکاریں گے جوشِ وحشت میں　　اے صبا گھر سے کیا خبر لائی
یا گزاریں گے سینہ کوبی میں　　ساعتِ صبحِ عیدِ تنہائی
ہوں گے یا عالمِ تصور میں　　سحرِ عید کے تماشائی
تال پر بیڑیوں کی ناچیں گے　　کھو کے ہوش اور بن کے سودائی

اے دلِ شاعرِ ملال نصیب — یہ تخیّل ہے بادپیمائی

اے اسیرِ سلاسلِ اوہام — دیکھ لی ہم نے تیری دانائی

گرم بانُو سے ڈر کے کرتا ہے — قیس کو منعِ گام فرسائی

درد سے بھی کبھی تڑپتے ہیں — بے نیازانِ چارہ فرمائی

عشق کو موت سے ڈراتا ہے — کیا کبھی موت عشق کو آئی

ہے یہ الزام ان دلیروں پر — جن کے تیور سے موت شرمائی

رہروانِ رہِ رضا ہیں وہ — خُوئے تسلیم کے ہیں شیدائی

سحر و شام اُن کا شیوہ ہے — شُکرِ خالق میں ناصیہ سائی

سرفروشانِ ملک و ملت سے

نہ رکھ اُمیدِ ناشکیبائی

غم زدوں کی عید

(عید کے دن قیدی بیٹے کی ماں کے جذبات)

یہ نظم ایامِ تحریکِ خلافت کی یادگار ہے

اے نورِ چشم! حافظ و ناصر خدا ترا
ہم منتظر رہے، تجھے زنداں میں آئی عید
تیرے لئے دعائیں تھیں، اور ذکر تھا ترا
سامانِ اشک و آہ سے ہم نے منائی عید
آ آ کے در سے تیرے احبا پلٹ گئے
اِس غمکدے میں جب نظر اُن کو نہ آئی عید
رہ رہ کے تھی سکوت شکن بس یہی صدا
کیسی یہ تو نے اب کے مُقدّر! دکھائی عید

افسردہ و ملول تھی وہ پیکرِ وفا

جس کے سہاگ میں تھی یہی ابتدائے عید

غمدیدگانِ ہجر کو تڑپا گئی ہے اور

اندوہ و رنج و حسرت و افسوس لائی عید

بیتاب کر رہا ہے مرے دل کو یہ خیال

زندانیوں نے کس طرح یارب منائی عید

احکامِ قید و بند بہت سخت ہیں وہاں

تیری ہوئی نہ ہوگی وہاں تک رسائی، عید

ہاں جادۂ رضا سے نہ اے دل ہو منحرف

غافل! ہے صبر و شکر تری انتہائے عید

انجامِ اتحاد

وعدے تھے اتحاد کے، دعوے خلوص کے

کیا ہو گیا وہ عہد، وہ پیماں کدھر گیا

حُبِّ وطن کہ تھی مِنَ الْاِیْمَانْ، وہ کیا ہوئی؟

وہ نقش دل سے کس طرح یک سر اُتر گیا؟

آتا نہیں ہے نعرۂ پُر جوش تا زباں

پہلو میں یک بہ یک دلِ شوریدہ مر گیا

آخر ہوا ہے دردِ وطن کا علاج کیا؟

جس سے تمام گریۂ شام و سحر گیا

حالت سے اپنی ہو گئے غافل ہم اس طرح

جادو کسی پہ کوئی ہو جس طرح کر گیا

کیا مطمئن ہیں اہلِ وطن، دیکھیے ذرا

گویا گلے سے طوقِ غلامی اُتر گیا

تسکینِ دل کو رہ گئی لے دے کے ایک بات

مُلتاں میں خیریت سے محرّم گزر گیا

۱۹۳۴ء

قافلے یُوں بھی تلف ہوتے ہیں!

قید سے ہوں گے رہا جب سرفروشانِ وطن
یوں کہیں گے دیکھ کر حالِ پریشانِ وطن
"حیف ہم جن کے لئے محرومِ آزادی ہوئے
اپنے ہاتھوں سے وہ جاہل وقفِ بربادی ہوئے
جن کو چھوڑا ہم نے راہِ منزلِ مقصود پر!
ہو گئے افسوس وہ دشتِ بلا میں منتشر
قافلے یوں بھی تلف ہوتے ہیں منزل کے قریب
کشتیاں ہوتی ہیں یوں بھی غرق ساحل کے قریب
جن کی آزادی کی خاطر ہم ہوئے وقفِ بلا
مانگتے ہیں آج وہ اپنی غلامی کی دُعا
ہم گئے جن کو ہوا خواہِ اخوّت چھوڑ کر
آج وہ بیٹھے ہیں سب ملّت کے رشتے توڑ کر

محفلِ حُبِّ وطن میں کل جو تھے شیر و شکر!
آج ہیں اک دوسرے کے تشنۂ خوں سربسر
اپنی زنجیروں کو کرتے ہیں کڑا، افسوس ہے
اُن کی نادانی پہ حیرت ہے، بڑا افسوس ہے
یہ نہیں ہرگز حصولِ دورِ آزادی کے طَور
بھائی بھائی کی لڑائی، خانہ بربادی کے طَور
خانہ جنگی یا تو نیرنگِ فنا دکھلائے گی
یا غلامی کی بہت میعاد بڑھتی جائے گی
وقت ہے اپنے کئے پر اب بھی پچھتائیں اگر
پھر سنبھل سکتے ہیں، دل میں کچھ بھی شرمائیں اگر

۱۹۲۴ء

انقلابِ آسماں

دیکھ اے دل! انقلابِ آسمانِ فتنہ گر!

شامِ غم سے ہے مبدّل صبحِ خندانِ وطن

منظرِ صبحِ وطن ہے، شاہدِ چاکِ جگر!

مظہرِ رنگِ مقدّر شامِ حرمانِ وطن

جس طرح ماتم کناں کوئی ہو زلفیں کھول کر

مو بمو ہے اس طرح حالِ پریشانِ وطن

پتّا پتّا ہو گیا اِس باغ کا وقفِ خزاں

ہو گئی آخر بہارِ سرو ریحانِ وطن

داغ اب جتنے دلِ اہلِ وطن میں ہیں، کبھی
پھول تھے اُتنے ہی تجھ میں اے گلستانِ وطن

یوں بھی دُنیا میں ہوا ہے کوئی سرتا سر اسیر
حلقۂ زنجیرِ غم ہے چشمِ حیرانِ وطن

زخم اک بھرنے نہیں پاتا کہ لگ جاتا ہے اور
وقفِ صد بیچارگی ہیں چارہ کارانِ وطن

یاد آیا ہے کہ تھا فخرِ جہاں ہندوستاں
باعثِ توقیرِ عالم جبکہ تھی شانِ وطن

داغ ہر اک دل میں ہے اس حسرتِ دیرینہ کا
پھر ہو روشن اے خدا! شمعِ شبستانِ وطن

پیامِ صُلحِ کُل

آہ پھر بزمِ وطن میں شورشِ بیہودہ ہے!

ہر مسرّت وقفِ غم، ہر عیش خوں آلودہ ہے

دشمنِ امن واماں ہے کس قدر بیجا خروش

فتنہ ہائے خفتہ کے حق میں ہے محشر زا خروش

بادۂ مہر و وفا کا قحط ہے اس دَور میں

دُردِ کیں ہر جام میں ہے جائے مَے اس دَور میں

یا خُمِ گردوں میں وہ دیرینہ مَے باقی نہیں!

یا کوئی خُم خانۂ اخلاص کا ساقی نہیں

وسعتِ مشرب کے بدلے تنگ ظرفی سے ہے کام

جام سے ٹکرا رہا ہے پے بہ پے محفل میں جام

نغمۂ صدق و صفا کی نَے سے اِن کو لاگ ہے
اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ ہے

اتّحاد اِن پر گراں ہے اور نفاق اِن کو عزیز
ایک مقصد ہے، مگر ہے افتراق اِن کو عزیز

جب کہیں تدبیر لڑتی ہے تو لڑ پڑتے ہیں یہ
جب ذرا تقدیر بنتی ہے، بگڑ پڑتے ہیں یہ

رنگ آخر لائیں گی اِن کی نفاق انگیزیاں
منتظر ہیں ذِلّتیں، بربادیاں، خُوں ریزیاں

کاش انھیں کردے کوئی سرمستِ جامِ صلحِ کُل
لائے نانکؔ کی طرح کوئی پیامِ صلحِ کُل

مُحبّانِ وطن

اُونچی ہے بہت شان محبّانِ وطن کی
ہیں جان محبّانِ وطن شانِ وطن کی
تصویر کہیں حالِ پریشانِ وطن کی
تنویر کہیں شمعِ شبستانِ وطن کی
یوں عشقِ وطن میں ہوئے تصویر وطن کی
تقدیر جو اِن کی ہے سو تقدیر وطن کی

ایثار کے پُتلے ہیں، خلوص اِن کا ہے مذہب
راحت سے اِنھیں کام، نہ آرام سے مطلب
رُوپوش جو ظلمت میں ہو اُمید کا کوکب
یہ چیر کے رکھ دیتے ہیں اک سُو جگرِ شب
کر دیتے ہیں، یوں مطلعِ انوار وطن کو
دکھلاتے ہیں اُمید کے آثار وطن کو

انصاف و مساوات پہ آنچ آئے، یہ تڑپیں
معصوم کے دل کو کوئی تڑپائے، یہ تڑپیں
زردار غریبوں پہ غضب ڈھائے، یہ تڑپیں
سینے پہ کوئی خنجرِ غم کھائے، یہ تڑپیں

ہے درد زمانے کا غرض اِن کے جگر میں
مضطر ہو کہیں کوئی، یہ بے چین ہیں گھر میں

حکّام کا ہر قہر و غضب ان کے لئے ہے
آلام کی دنیا کا تعب اِن کے لئے ہے
موجود ہر اک نالۂ شب اِن کے لئے ہے
نابود مگر صبحِ طرب اِن کے لئے ہے

زنداں ہے کبھی اور کبھی دیس نکالا
شمشیر کہیں سر پہ، کہیں سینے پہ بھالا

دنیا کے زر و مال پہ یہ تُف نہیں کرتے
گھر بار جو لُٹ جائے تاسُف نہیں کرتے
جاں دینے میں ہرگز یہ توقُّف نہیں کرتے
گردن بھی کٹا دیتے ہیں اور اُف نہیں کرتے

دل اِن کے ہیں دل اور جگر ہیں جگر اِن کے
سینے ہیں پئے تیغِ مصائب سپر اِن کے

فرحت دہِ آفاق ہیں جوں نکہت بر باد
ہیں فیضِ سبک رُوحی سے زنداں میں بھی آزاد
پابندِ قفس گرچہ ہوں مرغانِ چمن زاد
نغمے کا اثر رکھتی ہے رنگینیٔ فریاد

ہر چند تہِ خنجرِ بیداد ہوئی ہے
بُلبل کبھی منّت کشِ صیّاد ہوئی ہے ؟

کہیے جو اِنھیں ابرِ بہاراں تو بجا ہے
ملّت کا چمن اِن کے برسنے سے ہرا ہے
منزل یہ وہ ہے جس میں فنا عین بقا ہے
اس راہ میں مرنا جنھیں منظور ہوا ہے

نام اُن کے ہیں پائندہ دلِ اہلِ وطن میں
یوں رہتے ہیں وہ زندہ دلِ اہلِ وطن میں

مشرق کے آسماں پر

شاہ امان اللہ خاں والیِ افغانستان کی یاد میں

صدیوں کے بعد آخر چمکا تھا اک شرارا
روشن تریں ستارا مشرق کے آسماں پر

اُمید کی شعاعیں تھیں صاف آشکارا
جاں بخش اور دِل آرا مشرق کے آسماں پر

یُورش سے بادلوں کی گھبرا کے وہ ستارا
گُم ہو گیا بچارا مشرق کے آسماں پر

پھر اس کے دیکھنے کو بیتاب ہے نظارا
پھرتا ہے مارا مارا مشرق کے آسماں پر

چھائے ہوئے ہیں بادل رنج والم کے بادل
جور و ستم کے بادل مشرق کے آسماں پر
رہنے نہ پائیں یارب اس طرح غم کے بادل
مہماں ہوں دم کے بادل مشرق کے آسماں پر
پھر ہو کے جلوہ آرا نکلے وہی ستارا
اُمّید کا سہارا، مشرق کے آسماں پر

دیکھ اے ہلالِ شام!

بھگت سنگھ کی پھانسی

دَورِ فلک نے ہم کو بنایا ہے گو غلام
آزادیاں ہیں وہ، نہ تجمّل، نہ احتشام
اُجڑی ہوئی اگرچہ ہے بزمِ وطن، مگر
چھلکا نہیں ابھی مئے حُبِّ وطن کا جام
دیکھ اے ہلالِ شام!

زنداں میں ہو رہا ہے وہ پھانسی کا اہتمام
پیدا سکوتِ مرگ کے آثار ہیں تمام
دروازے کال کوٹھڑیوں کے وہ کھُل گئے
نکلے ہیں اُن سے تین جوانانِ خوش خرام
دیکھ اے ہلالِ شام!

کھولے ہوئے ہے اپنا دہن دیوِ انتقام
جلاّد کی نگاہ ہے شمشیرِ بے نیام
وہ بڑھ کے مرنے والوں نے نعرہ کیا بلند
جس سے لرز اُٹھے در و دیوار و سقف و بام
دیکھ اے ہلالِ شام!
یوں آ رہے ہیں جیسے ہو نوشاہ شادکام
اہلِ وطن کو کرتے ہوئے آخری سلام
پھانسی کی رسّیوں کو دیا بوسہ شوق سے
چہرے ہیں رنگِ ذوقِ شہادت سے لالہ فام
دیکھ اے ہلالِ شام!
اب آگے کیا بتاؤں میں نازک ہے یہ مقام
اے سُننے والے اشک بہا اور جگر کو تھام
پھندے گلے میں ڈال کے تختے نکال کے
جلاّد کر چکا ہے، جو کرنا تھا اُس کو کام
دیکھ اے ہلالِ شام!

نذرِ فنا ہوئیں وہ مچلتی جوانیاں!

تینوں کا ایک لحظہ میں قصّہ ہوا تمام

ماتم کا شور ہند میں ہر سُو بپا ہوا

تاروں نے آنکھوں آنکھوں میں دی اطلاعِ عام

گُم ہے ہلالِ شام!

گِنتا ہے عُضو عُضوِ شہیدانِ زیرِ دام

ہوتا ہے آہ اُن کے ٹھکانے کا اہتمام

رہنا گواہ بیاس کی موجو کہ کس طرح

لاشوں کے نیم سوختہ ٹکڑے ہوئے تمام

تُو بھی ہلالِ شام!

۱۹۳۱ء

ایک دوست کی گرفتاری پر

سنہ ۱۹۳۲ء میں دیوان جگن رام گاندھی (سابق منیر مالیات صوبہ سرحد) میانوالی میں بسلسلۂ تحریکِ عدمِ تعاون گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے۔ اس موقع پر یہ نظم موزوں ہوئی

تجھے زنداں میں دیکھا اور دلِ غمدیدہ بھر آیا
جگر کا خوں اُبل کر تا سرِ مژگانِ تر آیا

میانوالی کی گرمی اور مئی کے آخری دن ہیں
ہواؤں کو سکھاتے آگ برسانا یہی دن ہیں

ہوا صحرا سے آتی ہے سمُومِ جاں گزا ہو کر
جو رُک جائے، فضا رہ جاتی ہے دامِ بلا ہو کر

کوئی پروردۂ آغوشِ زیبائے تن آسانی!
غضب ہے، ایسے موسم میں اگر ہو جائے زندانی!

وطن کے پیار کو ترجیح دے کر عیش و عشرت پر
کڑی تو نے اُٹھائی، آفریں ہے تیری ہمت پر

بلا سے اپنی راحت اور اپنے چین کو کھویا

میانوالی میں تو نے حرّیت کا بیج تو بویا

یہ تخمِ حرّیت پھوٹے گا اک دن اور شجر ہوگا

خدا کے فضل سے پروان چڑھ کر بارور ہوگا

یہی منظور ہے شاید رضائے پاکِ یزداں کو

ہمارے بہتریں انساں کریں آباد زنداں کو

پکارے جائیں قیدی، مجرموں میں ہو شمار اُن کا

بڑھے مانندِ یوسف بن کے زندانی وقار اُن کا

رہے گی اے وطن! آخر تری حالت زبُون کب تک

بہائیں گے تری حالت پہ بیکس اشکِ خُون کب تک

نظر آئے گا کب تک ہر طرف منظر غلامی کا

رہے گا داغ کب تک تیرے ماتھے پر غلامی کا

رہے گی تا بکے دار و رسن کی گرم بازاری

رہینِ حلقۂ زنجیر کب تک ہوگی خودداری

دُعا اے خالقِ ارض و سما ہے خستہ جانوں کی

تری رحمت سے حل ہو جائے مشکل ناتوانوں کی

ہری کشن کے پھول

ہری کشن ضلع ہزارہ کا ایک محبِ وطن نوجوان لاہور میں زیرِ تعلیم تھا۔ ۱۹۳۰ء کے کانووکیشن میں یونیورسٹی ہال میں اُس نے گورنر پنجاب پر گولی چلائی گورنر تو بچ گیا، لیکن ہری کشن کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ اور میانوالی میں ایک صبح اُس کی لاش کو بہت دُور ویرانے میں لے جا کر سرکاری طور پر جلا دیا گیا۔ اُدھر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اتفاق سے محروم اسی مدت میانوالی میں تھا۔ تمام شہر کی فضا ماتمی نظر آتی تھی۔ یہ اشعار وہیں موزوں ہوئے۔

وہ فضائے دشت میں پھر کسی کی چتا کے شُعلے بلند ہیں
نہ پہنچ سکا کوئی تفتہ دل کہ تمام راستے بند ہیں
نہ صدائے نالۂ غم وہاں، نہ نشانِ سوزِ جگر وہاں
نہ قریب ہے کوئی آشنا، نہ ہے اقربا کا گزر وہاں
سرِ دشت آہ! دمِ سحر یہ اکیلی جلتی ہوئی چتا
نہ تو الوداع کہی گئی، نہ برائے دید کفن کھلا

نہیں ماتمی کوئی خُبر سحر کہ ہے سینہ چاک بھی، زرد بھی!
اسی غم سے لب پہ ہے بار بار نسیم کے دمِ سرد بھی!
نہیں اب وہ شعلوں کی سرکشی، وہ فروغ اب نہیں آگ میں
کہ ذرا سی دیر میں جل بُجھا وہ شباب، اُس کی وہ حسرتیں
یہ نتیجہ سوزِ وطن کا ہے، یہ وطن کے دَرد کا ہے صِلا!
کئی نوجواں اسے پائیں گے، کئی نوجوانوں کو مِل چُکا!
انھیں پائمال نہ کر صبا، کہ ہری کرشن کے یہ پھول ہیں
جو وطن کی آن پہ مر مٹا اُسی بے وطن کے یہ پھول ہیں!

پیامِ حُرّیت

یہ جو شورِ ماتمِ داس[1] ہے یہ سبیلِ شیوۂ عام ہے
یہی موت ورنہ ہے زندگی، یہی شئے حیاتِ دوام ہے

وہ زباں سے اپنی سُنا گیا، وہ عمل سے اپنے دِکھا گیا
کہ وفا پرستِ وطن ہے جو خور و خواب اس پہ حرام ہے

وہ شباب جس کو ہے یہ الم کہ وطن ہے وقفِ ہزار غم
نہ حریفِ شاہد و نغمہ ہے، نہ حریصِ بادہ و جام ہے

اسی کش مکش میں جو مر گیا، وہی دامِ غم سے رہا ہوا
جو نہ پھڑپھڑائے تو کیا کرے وہ پرند جو تہِ دام ہے

یہ ہیں مکر و حیلہ کے سلسلے انھیں داس جیسے ہیں توڑتے
نہ کوئی ہے وارثِ صاحبی، نہ کوئی کسی کا غلام ہے

یہ وطن کا روزِ سیاہ بھی نہ رہے گا دورِ زمانہ میں
نہ ہمیشہ جلوۂ صبح ہے نہ ہمیشہ پرتوِ شام ہے

تِلک[2] حزیں نے جو کچھ کہا، نہیں شاعرانہ مبالغہ
سُنو اس کو اہلِ وطن ذرا کہ یہ حُرّیت کا پیام ہے

[1] جتیندر ناتھ داس جی نے بھوک ہڑتال کر کے ۱۹۳۱ء میں جان دی
[2] تِلک مصنف کے نام کا مخفف ہے۔

مِٹ جائے گا

پنجاب کے ایک اخبار نے لکھا تھا "ایک دن ہندوستان مِٹ جائے گا"
اس کے جواب میں یہ شعر کہے گئے۔

تو بھی مِٹ جائے گا، جب ہندوستاں مِٹ جائے گا
اِس کے مٹنے سے ترا نام و نشاں مِٹ جائے گا
جس میں تُو اور تیری فطرت کے ہوں غدّارِ وطن!
قوم وہ مِٹ جائے گی، وہ خانداں مِٹ جائے گا!
واہ، اے ناعاقبت اندیش، مرغِ بے وفا
تُو بہت خوش ہے کہ تیرا آشیاں مِٹ جائے گا
یوں تو ہر اک چیز فانی ہے، مگر پیش از قضا!
جو وطن دشمن ہے وہ ننگِ جہاں مِٹ جائے گا

ایشیا اور یورپ

درحقیقت ہے یہ خونِ آرزوئے ایشیا

جامِ یورپ میں جو رخشاں ہے مئے عنّاب رنگ

رنگِ روئے ایشیائی اُڑ کے جا پہنچا وہاں

اس قدر رنگیں نہ تھا پہلے خیابانِ فرنگ

لگ نہیں سکتا کنارے اہلِ مغرب کا جہاز

اہلِ مشرق ہوں نہ جب تک طعمۂ کامِ نہنگ

ایشیا میں آکے بن جاتے ہیں لعلِ بے بہا

ساحلِ یورپ کے کنکر، بے حقیقت لختِ سنگ

روزِ ہیجا مشرقی کے واسطے ہے کُشت و خوں

مغربی ہے اور بزمِ عہد و پیماں بعدِ جنگ

بزمِ مغرب میں جو یہ جوشِ شراب و نغمہ ہے

اشک و آہِ ایشیا ہے اے حریفِ جام و چنگ

گھونٹ دیتے ہیں گلا اس کا کسی تدبیر سے

ہوتی ہے مشرق کے دل میں جب کوئی پیدا اُمنگ

جب یہ حالت ہو تو مشرق کیوں نہ اب بیدار ہو

بے توقف، بے تحاشا، بے تامّل، بے درنگ!

غدّارِ وطن!

ہو کے ہندی جو ہے تُو اپنے وطن کا دشمن
رُوح غدّار کی تیرے تنِ ناپاک میں ہے
وہ شرر جس سے دلِ اہلِ وفا ہے روشن
وائے افسوس، کہ افسردہ تری خاک میں ہے
جاں سپارانِ وطن دیتے ہیں جانیں جس پر
فہم میں ہے ترے وہ بات نہ ادراک میں ہے
محفلِ عیش میں تُو مستِ مئے بے فکری
زلزلہ آہِ ستم دیدہ سے افلاک میں ہے
انقلابات کی اک سیل چلی آتی ہے
تُو ہے غافل، تری تقدیر تری تاک میں ہے
یہ وہ طوفانِ بَلا ہے کہ نہیں ٹل سکتا
دیکھ لے گا کہ تو شاملِ خس و خاشاک میں ہے

چھوت چھات

او بدنصیب بھارت، پھوٹے نصیب تیرے
شفقت سے آہ تیری ہیں دُور تیرے بچّے
محروم جن کو رکھّا انسانیت کے حق سے
جن کو ذلیل سمجھا، تحقیق ساتھ اُن کے
آخر میں سب کو یکساں ذلّت نصیب ہوگی
یہ چھُوت چھات کیسی تونے روا رکھی ہے
ناراض تجھ سے تیرا اخلاقِ زندگی ہے
پاکیزگی پہ اپنی یہ ناز ابلہی ہے
جو پاک ساز تجھ میں ہے اُن میں بھی وہی ہے
ہرگز تجھے نہ یُوں تو عزّت نصیب ہوگی

پہلو میں اُن کے دل ہے اور دلنواز دل ہیں
رکھتے ہیں ساتھ اس کے عجز و نیاز دل میں
تو وہ کہ بھر کے بیٹھا ہے کبر و ناز دل میں
یہ اُونچ نیچ کا ہے جو امتیاز دل میں
اس سے کبھی نہ تجھ کو رفعت نصیب ہوگی

مخدوم تو ہے اُن کا خدمت گزار ہیں وہ
جاں اور دل اپنے تجھ پر کرتے نثار ہیں وہ
وہ تیرے بارکش ہیں، کب تجھ پہ بار ہیں وہ
پھر کیوں ذلیل ہیں وہ، کیوں بے وقار ہیں وہ
اُن کے بغیر تجھ کو راحت نصیب ہوگی؟

جب محترز نہیں ہے اُن سے خدائے برتر
چلتا ہے کس لئے تو سائے سے اُن کے بچ کر
بخشے ہیں اُن کو اُس نے انسانیت کے جوہر
قیمت میں کم نہیں ہے گر خاک میں ہے گوہر
جوہر سے اپنے اس کو قیمت نصیب ہوگی

مثنوی

تصویرِ غلامی

ہے مصدرِ صد گناہ غلامی — جس سے ہو ذلیل ہر گرامی

افراد ہیں بے وقار اس سے — اقوام ذلیل و خوار اس سے

مجبوری و بے کسی یہی ہے — بے چارگی بندگی یہی ہے

شیروں کو کیا ہے اس نے روباہ — جو کوہِ گراں تھے، ہو گئے کاہ

انساں کو، یہ دشمنِ فضائل — کر دیتی ہے سخت بدخصائل

ناراستی و ریا و خسّت — بغض و حسد و فریب و غیبت

پستیِ خیال و فعل و ہمّت — غمّازی و سازش و دنائت

یہ عیب ہیں اس کے دست پرور — ان سے بھی بلکہ اور بدتر

گر شرم و حیا سے کام لیجے
ممکن نہیں، اُن کا نام لیجے

کھو دیتی ہے جوہرِ شرافت
بو دیتی ہے تخمِ نخلِ خسّت

ہو جاتا ہے دل پہ بڑھ کے قائم
خوفِ خالق سے رُعبِ حاکم

محکومِ بشر جہاں بشر ہے
نایاب تمیزِ خیر و شر ہے

انساں کے لیے رضائے انساں
کرواتی ہے کارہائے شیطاں

مر جاتے ہیں مدرکاتِ علوی
دب جاتی ہیں سب صفاتِ علوی

بالیدگیِ قوائے فطرت
ممکن نہیں زیرِ بارِ دہشت

رہ جاتے ہیں سُکڑ کے ہوش و فرہنگ
روئیدگی جس طرح تہِ سنگ

کر بیٹھتی ہے سرشتِ آزاد
اوصاف تمام اپنے برباد

رُوح و تن و جاں بحالِ ابتر
رہ جاتے ہیں سر بسر سمٹ کر

ہوں غیر کفیلِ حاجتِ نفس
رہ سکتی نہیں ہے عزّتِ نفس

شہباز کہ شاہِ طائراں ہے
قبضے میں فضائے آسماں ہے

رہ کر حیثیت بدامِ تسخیر
ہو جاتا ہے بدتر از عصافیر

گو خود ہے شکار مار لاتا
آقا کے ہاتھ سے ہے کھاتا

نادان طفیلِ رعبِ فائق
ہے مانتا اُس کو اپنا رازق

جنگل کا وہ پیل چرخِ پیکر
پربت کو ہلائے جس کی ٹکّر
ہوتا ہے جب آدمی کے بس میں
آزادی کی چھوڑتا ہے رسمیں
کرتا ہے خلافِ حکمِ فطرت
مزدور کی طرح سب مشقّت

کھاتا ہے مزے سے دال روٹی
کچّی ہو جلی ہو، خواہ موٹی

جنگل کا بادشاہ ہے شیر
کر لیتا ہے جب اسے بشر زیر
بلّی کی طرح وہ بن کے مسکیں
سرکس کے نباہتا ہے آئیں

دب جاتی ہے دُم برعبِ قائد
کرتا ہے اشارے پر قواعد!

انساں بھی یُونہی غلام ہو کر
رہ جاتا ہے جوہر اپنے کھو کر
گر جاتا ہے مرتبہ بشر کا
دیتا ہے وہ کام گاؤ خر کا
ہر بات میں دُوسرے کا محتاج
کیوں کر رکھے اپنے نفس کی لاج

کرتی ہے اختراع و ایجاد
باعزمِ بلند قومِ آزاد
باطبعِ فسردہ قومِ مجبور
رہتی ہے علوّ و فن سے معذور

تخئیل دکھائے خاک پرواز
موجود ہو جب کمند انداز

حاکم پہ غرورِ حکمرانی
محکوم پہ فکرِ جاں فشانی

محکوم کو ہو نصیب خواری
حاکم کی ہے اس میں کامگاری

حاکم کا یہی ہے خاص مقصود
ہے اس کی متابعت میں بہبود

دم کوئی بھرے نہ خودسری کا
دعوےٰ نہ کرے برابری کا

بڑھنے دے کسی کی کیوں وہ طاقت
کمزور پہ سہل ہے حکومت

ظاہر میں کیا کرے مدارات
نیت میں ہے اس کی ایک ہی بات

یعنی کہ سدا رہے یہ مغلوب!
ہر طور ہے اپنا غلبہ مطلوب

کرتا ہے کبھی نمائشِ فر
طاری ہو تا کہ رعب سب پر

تزویر کا پھینک کر کبھی دام
میٹھی باتوں سے کرتا ہے رام

محکوم سے کام گر ذرا سا
سرزد ہو خلافِ طبع والا

گردن زدنی ہے، کُشتنی ہے
مفقود مجالِ دم زنی ہے

اچھا کوئی یا کوئی بُرا ہے
اک لاٹھی سے سب کو ہانکتا ہے

یکساں معتوب ہیں بد و نیک
دونوں کے لئے ہے ہتھکڑی ایک

لکھتے ہیں مورخینِ یوناں — اک بار بہ انقلابِ دوراں
پیدا ہوئے تفرقوں کے آثار — ہونے لگی ابتری نمودار
اوساطِ فرنگ سے نکل کر — اک قوم نے کرلیا مسخّر
یونان پہ بہ عہدِ باستانی — صدیوں رہی اس کی حکمرانی
اس قوم کا یہ رہا وطیرہ — با روئے شگفتہ، قلبِ تیرہ
میلے لگوا کے، دے کے انعام — اہلِ یوناں کو کرکے خوش کام
کھیلوں کے مقابلے کراتی — اور رنگ اکھاڑوں کے جماتی
چڑھتے نظر اُس کی جتنے تن زور — تحسین کا جنھیں بہت ملے شور
پہلے انھیں سرفراز کرتی — بخشش کے خزانے باز کرتی

پھر زہر سے، سازش اور فن سے
لے لیتی تھی جان اُن کے تن سے

جس قوم کی مرگ و زندگانی — جس قوم کا رنج و شادمانی
جس قوم کا ڈوبنا اُبھرنا — اور جس کا بگڑنا یا سنورنا
جس قوم کی سب بُرائی نیکی — اور جس کا زوال اور ترقّی
صدیوں سے ہو زیرِ حکمِ اغیار — اس قوم کا حال کیوں نہ ہو زار

صدیوں سے غلام جو رہی ہو
حالت اس کی نہ کیوں ردی ہو

دنیا میں یہ حالتِ غلامی | یہ ذلت و یاس و تلخ کامی
سچ پوچھو تو قہرِ کبریا ہے | اعمالِ گزشتہ کی سزا ہے
میعاد گزر کے جب سزا کی | رحمت ہوتی ہے پھر خدا کی
غم کی شبِ تار ہے گزرتی | پھر صبحِ اُمید ہے نکھرتی
ہو جاتے ہیں قوم میں نمودار | مردانِ جری و صاحب ایثار
باغیرت و ہوشمند و اشرف | جاں باز، سرِ نیاز بر کف
کھوتے ہیں وہ اپنا چین آرام | لیتے ہیں وہ جد و جہد سے کام
زنداں ہیں میں کھینچتے سلاسل | ہو جاتے ہیں موت کے مقابل
القصہ وطن پہ ہو کے قرباں | ہیں ڈالتے قومِ مردہ میں جاں

ہو جاتی ہے پھر وہ قوم آزاد
یوں ہوتے ہیں غم نصیب پھر شاد

اپنا وطن

وسعتِ عالم میں اے خاکِ وطن، تیرے سوا
سرزمیں وہ کون سی ہے جس کو میں اپنا کہوں

تیری عزّت سے معزّز، تیری ذلّت سے ذلیل
اپنی ہستی کو مرادف تیری ہستی کا کہوں

جلوہ گر ان میں وہ فکرِ آسماں پیما ہوئی
وادیوں کو تیری رشکِ عالمِ بالا کہوں

رازِ امن و مہر مضمر ہے اہنسا میں تری
کیوں نہ تجھ کو فخرِ دین و نازشِ دنیا کہوں

بے رُخی تجھ کو دکھا کر، تجھ سے ہو کر بے نیاز
وہ جو رُوم و شام کے شیدا ہیں، اُن کو کیا کہوں

ہماری حالت

بہے جاتے ہیں یارانِ وطن سیلابِ مغرب میں
کہ سُوجھی ہے نجات اپنی اُنھیں آدابِ مغرب میں
نہ تھی گویا کوئی تہذیب اپنی روئے عالم پر
کرم اپنا کیا ہے اہلِ مغرب نے بڑا ہم پر
سکھایا ہے ہمیں دنیا میں انساں کی طرح رہنا
مہذّب بن کے رہنا اور بہت اچھی طرح رہنا
نظر ظاہر پہ رکھنا بھُول جانا اپنے باطن کو
چلانا شب کو گھر میں دَور، دفتر میں قلم دن کو

تماشا گاہ میں بیوی کو اور بچوں کو لے جانا
جو گانا سُن کے آئیں، اُن سے سُننا اور خود گانا
سُرور آنکھوں میں آئے، لڑکیاں ناچیں جو مجلس میں
ترقی آرٹ کی ہے، کیا بُرائی ہے بھلا اس میں
سرود و رقص سے ہوتی ہے حاصل دل کو فرحت بھی
انہی اشغال سے قائم رہا کرتی ہے صحت بھی
تڑپ کر بھوک سے ہمسایہ مرتا ہے تو مرنے دو
کلب کو جاؤ تم، نیچر کو اپنا کام کرنے دو
غرض ہے عشرتِ امروز سے، خوش ہیں اسے پاکر
نہیں پروا، وہ عزت سے ملے یا گالیاں کھا کر
حمیت مر چکی، لیکن کہیں ماتم نہیں اس کا
جنازہ اُٹھ گیا غیرت کا، لیکن غم نہیں اس کا

داروئے تلخ

تجھے او بابُوئے صاحب نما! آتی حیا بھی ہے؟
کوئی تیرا وطن بھی، کوئی ایماں بھی؟ خدا بھی ہے؟
یہ سودا تا کجا سر میں ترے آرائشِ تن کا
تری خود بینی و نخوت کی آخر انتہا بھی ہے؟

تجھے دُنیا میں، او غافل! بجز شغلِ خود آرائی
کسی سے کچھ غرض بھی ہے، کسی سے واسطا بھی ہے؟
نہیں پہنچی صدا دردِ وطن کی تیرے کانوں تک
خلافت کے الم کا جس میں شامل ماجرا بھی ہے؟

اسیرانِ وطن کے حالِ ابتر سے نہیں واقف!
کہ اُن میں سے ہر اک مظلوم بھی ہے، بے خطا بھی ہے!

بزعمِ خویش اے ناداں! تو ہے محفوظ ساحل پر
کہ اپنی آپ کشتی بھی ہے، اپنا ناخدا بھی ہے!

مگر اے خود غرض! ہے جزوِ ملّت یہ تری ہستی
گئی ملّت، تو دل میں سوچ، پھر تیری بقا بھی ہے؟

لپکتی آ رہی ہیں جس کی موجیں تیری ملّت پر
نظر آخر تجھے آتا وہ طوفانِ بلا بھی ہے؟

نہیں نکٹائی میں پتلون و کالر میں تری عزّت
اُسی میں ہے تری عزّت، ہے جس میں قوم کی عزّت

آہ اے میرے بدنصیب وطن — تفرقوں نے تجھے کیا بدنام
کونسے مُلک میں نہیں ہے آج — اختلافات کا ترے اعلام
نہ رہی اتفاق کی صورت — مٹ گیا نقشِ اتحاد تمام
تجھ پہ روشن ہے یہ حقیقت بھی — اس سے واقف ہیں تیرے خاص اور عام
کہ غلامی سزا نفاق کی ہے — اس میں ہرگز نہیں ہے جائے کلام
اور کہتے ہیں جس کو آزادی — ہے فقط اتحاد کا انعام

علم و حکمت کی سرزمیں، تجھ پر — فتنہ و شر کا بچھ گیا ہے دام
تیری صبحِ اُمید کو ہم نے — کر دیا تیرہ فام صورتِ شام

طاق پر رکھ دیئے صحیفے سب
مئے غفلت کا پی کے ہم نے جام
چھوڑ کر مسلکِ رواداری
اپنے خالق کے توڑ کر احکام
نہیں مٹنے میں اب کسر باقی
نظر آتا ہے ہند کا انجام

—

ہو رہا تھا یوں ہی پریشاں میں
رو رہا تھا یوں ہی دلِ ناکام
کہ صدا غیب سے سُنی میں نے
جس میں پنہاں تھا زیست کا پیغام
"ہندیو! اب بھی ہو سکو گے تم
بزمِ اقوام میں بلند مقام
صدق دل سے اگر ہو زیرِ عمل
گُورو نانک کا صُلحِ کُل پیغام"

پھول برساؤ

جن سرافرازوں کی رُوحیں آج ہیں افلاک پر
موت خود حیراں تھی جن کی جرأتِ بے باک پر
نقش جن کے نام ہیں اب تک دلِ غمناک پر
رحمتِ ایزد ہو دائم اُن کی جانِ پاک پر
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھول برساؤ کہ پھولوں میں ہے خوشبوئے وفا
تھی سرشتِ پاک اُن کی عاشقِ خوئے وفا
موت پر اُن کی لگے جو روئے دررُوئے وفا
کیوں نہ ہوں اہلِ وطن کے اشکِ خوں جھوئے وفا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھول برساؤ کہ تھے اُن میں کئی ایسے جواں

نوجوانی جن کی تھی رشکِ بہارِ بوستاں

ہو گیا گلزارِ ہستی جن کا پامالِ خزاں

دے گئے لیکن وطن کو وہ بہارِ جاوداں

پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھول برساؤ کہ تھے اُن میں کئی کم سن ابھی

تھے جہاں میں کھیلنے ہنسنے کے اُن کے دن ابھی

بے ریا، یکساں تھے اُن کے ظاہر و باطن ابھی

مر گئے بے نام، پائندہ ہیں وہ لیکن ابھی

پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

تھے وہ فخرِ آدمیت، افتخارِ زندگی

تھے وہ انساں طُرّۂ تاجِ وقارِ زندگی

اُن کے دم سے تھا چمن یہ خارزارِ زندگی

تھا نَفَس اُن کا نسیمِ نو بہارِ زندگی

پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

چشمِ ظاہر بیں سمجھتی ہے کہ بس وہ مر گئے
درحقیقت موت کو فانی وہ ثابت کر گئے
جو وطن کے واسطے کٹوا کے اپنا سر گئے
خوں سے اپنے رنگ تصویرِ بقا میں بھر گئے
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

دیکھ لینا خونِ ناحق رنگ اک دن لائے گا
خود غرض ظالم کئے پر اپنے خود پچھتائے گا
راہ پر دورِ زماں آخر کبھی تو آئے گا
آسماں اس خاک کی تقدیر کو چمکائے گا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

۱۹۳۲ء

آزادی ملنے کے بعد اس بند کا اضافہ ہوا۔

جن کی قید و بند نے دلوائی آزادی ہمیں؛ جن کی بربادی سے ہاتھ آئی ہے آبادی ہمیں
جن کے ماتم نے دیا ہے نغمۂ شادی ہمیں؛ دے کے اپنی جاں، جینے کی تمنا دی ہمیں
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر! (محروم)

بزرگانِ سلف اور ہم

بے جا ہے ناز عظمتِ دیرینہ پر ہمیں
نخلِ کہن سے خاک ملے گا ثمر ہمیں

غافل وہ ہیں کہ اتنی نہیں ہے خبر ہمیں
اب کھینچ لے چلا ہے زمانہ کدھر ہمیں

قعرِ زمیں میں ہم ہیں، نظر آسماں پہ ہے
اور رفعتِ سلف کا فسانہ زباں پہ ہے

اب تک طلسمِ خوابِ شبینہ نظر میں ہے
اب تک گرانیِ مئے اسلاف سر میں ہے

خلقت تمام جاگ اٹھی دورِ سحر میں ہے
غافل پڑے ہیں ہم، شبِ تاریک گھر میں ہے

ہر چند اب نہ مے ہے نہ ساقی نہ جام ہے
سر میں بھرا مگر وہی سودائے خام ہے

آقا ہوئے بزرگ ہمارے، غلام ہم
وہ چشمۂ فیوض تھے اور تشنہ کام ہم

ممتاز وہ عمل سے تھے، حُسنِ صفات سے
آلودہ ذات پات سے ہم چُھوت چھات سے
مانا کہ اُن میں تاجور و تاجدار تھے
لشکرکش و غنیم کُش و کامگار تھے
فخرِ زمانہ، نازشِ ملک و دیار تھے
دانائے رازِ گردشِ لیل و نہار تھے
اوصاف اُن کے آہ! تلف کر چکے ہیں ہم
تذلیلِ رفتگانِ سلف کر چکے ہیں ہم
اخلاق اُن کا اور نہ ایثار ہم میں ہے
باقی نہ اُن کی جرأتِ کردار ہم میں ہے
حق سے رہا جو اُن کو نہ وہ پیار ہم میں ہے
ذوقِ حیات سے جو ہے بیزار، ہم میں ہے
ممکن ہے اُن کے نقشِ قدم پر اگر چلیں
گزرے گئے زمانہ میں کچھ کام کر چلیں

محکوم زیردست، زبردست حکمراں
دائم اسی روش پہ ہے دنیا کا بندوبست

کمزور نارسا ہے مقامِ بلند تک
بے سُود اُس کے واسطے ہے جدّوجہد جست

باطل ہیں دعویٰ ہائے مساوات سربسر
مشکل نہیں ہے عہدِ مساوات کی شکست

یہ کینیا کا فیصلہ کچھ آج کا نہیں!
کیوں سرنگوں ہیں شاستریِ وفا پرست

اپنے وطن میں جب نہ ہوئے سرفراز ہم
کیوں کر نہ مُلکِ غیر میں ملتا مقامِ پست!

(جنوبی افریقہ) میں ۱۲ ہندوستانیوں کو جبراً پست علاقے میں بسانے کا حکم ہوا۔

مرے بدنصیب وطن! ترا ابھی دُور دَورِ سعید ہے

شبِ تارِ یاس میں خیمہ زن، ابھی تیری صبحِ اُمید ہے

تہِ تیغِ جور تڑپ ابھی، اسی طرح اور تڑپ ابھی

کوئی زندگی ہے یہ زندگی کہ نہ زندہ ہے نہ شہید ہے

سرِ چرخ تیری عدوِ جاں، کئی بے قرار تھیں بجلیاں

ترے گھر سے شعلۂ کیں اُٹھا، یہ وہ فتنہ ہے کہ مزید ہے

ہوئی عام رسم عناد کی، کہ ہوا چلی ہے فساد کی

نہ وہ اختلاط کی مجلسیں نہ وہ لطفِ گفت و شنید ہے

وہ ہے سر پہ سایۂ شامِ غم کہ ہلالِ عید ہے تیغ دم

کبھی کہتے تھے اسے دیکھ کر، درِ میکدہ کی کلید ہے

یہ غضب ہے کیا تِلکؔ حزیں ہوئی نالہ زار یہ سرزمیں

نہ کہیں نوائے اُمید ہے، نہ کہیں صدائے نوید ہے

لہ تلک مصنف کے نام کا مخفف ہے

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

گاندھی کہ آج حُسنِ عمل سے فرشتہ ہے
کہنے لگے ہیں اُس کو کئی بدسرشت، بد

وہ خیر خواہِ ہند ہے اور جاں نثارِ ہند
ہاں دشمنانِ ہند کو لازم ہے اس سے کد

گاندھی کے حق میں اس نے نکلتی ہیں گالیاں
جو دل کہ خود ہے سوختہ آتشِ حسد

دیتے ہیں ورنہ ہندو و مُسلم دُعا اسے
کہتے ہیں اُس کو رہبرِ اعظم بہ شدّ و مد

اے منکرانِ عظمتِ ہندوستاں سُنو
عیاریاں تمھاری ہیں فضلِ خدا سے رد

یہ بات اگرنہ رسمِ شرافت سے ہو بعید
ہم بے نقط سنائیں تمھیں اور بے عدد
تم جیسے بد زبانوں پہ صادق یہ قول ہے
"مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند"

قطعہ

گھبرا نہ مصیبت میں، نکلے گا قیامت میں
ارمان ترے دل کا، انصاف کے اے خواہاں
دنیا میں تو بس اتنا انصاف نظر آیا
ڈائر کے لئے پنشن، گاندھی کے لئے زنداں!

مہاتما گاندھی کے ایک برت پر

سُن کر مہاتما کا یہ عزمِ جاں سپاری
ہر دردمند دل پر اندوہ و غم ہے طاری

اپنے ہی دل پہ کھایا جس پیکرِ وفا نے
بھارت کے تن پہ آیا جب کوئی زخم کاری

انسانیت کی خدمت مسلک رہا ہے جس کا
کی جس نے نذرِ انساں عمرِ عزیز ساری

اُس کے اس امتحاں میں شامل کرم ہو تیرا
یہ التجا ہماری ہے تجھ سے ذاتِ باری

یہ ناخدا ہمارا، یارب رہے سلامت
نکلی نہیں بھنور سے کشتی ابھی ہماری

قطعہ

اس میں کچھ شک نہیں کہ گاندھی ہے
دورِ حاضر میں بے نظیر انساں

حامیِ شر اسے بتاتے ہیں
کئی ایسے بھی ہیں شریر انسان

گاندھی جی کا فیضِ عام

چھڑا لایا اسیرانِ وطن کو   مبارک ہے یہ تیرا کام گاندھی

دلِ ہندوستاں سے اٹھ رہی ہے   ترے حق میں دعائے عام گاندھی

تمنائیں ترے دل کی برآئیں   ترے دشمن رہیں ناکام گاندھی

ہوئے ممنونِ فیضِ عام ہم بھی   ہمیں بھی مل گیا انعام گاندھی

رہا ہو کر وطن میں اپنے آئے

فدائے ملک بھجن رام گاندھی[1]

شعر

اسیرانِ وطن کے رہا ہونے پر!

بہارِ جاں فزا آئی وطن کے گلستانوں میں   قفس خالی ہوئے اور چہچہے ہیں آشیانوں میں

---

[1] دیوان بھجن رام گاندھی مصنف کے دیرینہ دوستوں میں ہیں۔ میانوالی میں وکالت چھوڑ کر اور کانگریس کی عملی تحریک میں شامل ہو کر قید ہوئے۔

دُعا

مہاتما گاندھی کے ۲۱ روزہ برت پر

بگڑی ہوئی بنا دے اے بیکسوں کے والی!
کانٹوں کو پھول کر دے، صحرا کو باغ کر دے
بادِ فنا کی زد میں جو ٹمٹما رہا ہے
اپنے کرم سے روشن پھر وہ چراغ کر دے

فضل و کرم کا تیرے رکھتے ہیں اک سہارا
پُوری امّید اپنی اے کارساز کر دے
درکار ہے وطن کو طولِ حیاتِ گاندھی
کم بھی اگر ہے باقی، اس کو دراز کر دے

باغِ وطن اُجڑ کر ویرانہ ہو گیا ہے
اس کی خزاں کو یا رب فصلِ بہار کر دے

منجدھار میں پھنسا ہے اُمّید کا سفینہ
الطافِ بیکراں سے تُو اس کو پار کر دے

ترکِ غذا پہ گاندھی عامل ہے جن کی خاطر
پیدا دلوں میں اُن کے تُو التفات کر دے
اس امتحاں میں پورا اُترے ترے کرم سے
پانی کو اس کے یارب آبِ حیات کر دے

دل کو ڈرا رہی ہیں پھر یاس کی گھٹائیں!
اُمّید کی شعاعوں کو جلوہ ریز کر دے
اکیس[21] دن کو یارب اکیس[21] پل بنا دے
ارض و سما کی گردش کو اور تیز کر دے

رُباعی

انوارِ حیات کا ہے پیکر گاندھی
مثلِ خورشید جلوہ گستر گاندھی
بھارت میں رہے زندہ سلامت یارب
بھارت کی نجات کا پیمبر گاندھی

فرشتۂ رحمت

رحمت کے آہ! اگرچہ سزاوار ہم نہیں
گاندھی ہمیں فرشتۂ رحمت سے کم نہیں
اِس بدنصیب ملک کا سرمایۂ وقار
شان و شکوہِ لشکر و طبل و عَلم نہیں
نفسِ وطن یہ پیکرِ ایثارِ نفس ہے
کچھ بھی نہیں وطن میں اگر اس کا دم نہیں

گاندھی جی

ذرا جب اُٹھ کے قومی ولولوں نے کچھ ہوا باندھی
وہیں اُن کے دبانے کو دُھواں دھار اک اُٹھی آندھی
سلامت تیری کشتی کو خدا لے جائے ساحل تک
تری کوشش میں شامل ہے غریبوں کی دُعا گاندھی

آہ! موتی لال

آہ! اے نامدار موتی لال — نازشِ روزگار، موتی لال
ماتمی ہے ترا جہاں سارا — فخرِ شہر و دیار، موتی لال
لال تھا بد نصیب بھارت کا — باعثِ افتخار موتی لال
تھا سرِ تاجِ آبروئے وطن — گوہرِ شاہوار، موتی لال
حکم اُس کا روانِ لوں پر تھا — گو نہ تھا تاجدار موتی لال
باغِ حُبِّ وطن میں آیا تھا — بن کے بادِ بہار موتی لال
جوگ تو نے لیا وطن کے لئے — اے صداقت شعار موتی لال
زندگی تو نے اپنے ہاتھوں سے — کی وطن پر نثار موتی لال
چل دیا، اور بد نصیبوں کو — کر گیا اشکبار موتی لال

رہبرِ اعظمِ وطن نہ رہا
آہ! وہ عالمِ وطن نہ رہا

اے محبِّ وطن، فدائے وطن | درد میں تُو ہوا دوائے وطن

ہو سکا اور کس کی ہمّت ہے | تُو نے جو کچھ کیا برائے وطن

ہوئی نزدیک منزلِ مقصود | تُو ہوا جب سے رہنمائے وطن

تیری جرأت پہ ناز تھا اس کو | سرنگوں کیوں نہ ہو لوائے وطن

ہر نئے مرحلے پہ ماتم نو | آہ اے بختِ نارسائے وطن

دیکھیے کب ہو دورِ عالم میں | ختمِ دورانِ ابتلائے وطن

تیرا جلوہ تھا اک شعاعِ امید | ہو گئی تیرہ پھر فضائے وطن

کہیں جنّت میں تو نہ ہو مضطر | کہ فلک رس ہیں نالہ ہائے وطن

وہ جو ہے تیری یادگار عزیز | اس کے حق میں ہے یہ دعائے وطن

کہ سلامت رہے جواہر لال
تا قیامت رہے جواہر لال

مقامِ عبرت

اپنی تقدیر کو پھر اہلِ وطن روتے ہیں
پھر جواہر کی اسیری پہ ہے برپا شیون
رات بھر نیند نہ آئی اسی بیتابی میں
لے گیا مجھ کو تصور سوئے آنند بھون
رونقِ بزمِ احبا تھا جہاں موتی لال!
وہ مکاں جس میں شگفتہ تھے لطیفوں کے چمن
جس میں رہتا تھا چکا چوند کا عالم شب و روز
جلوہ افروز تھی اُمّید کی جاں بخش کرن

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ محل ہے عبرت کا مقام

شب تاریک کا اوڑھے ہوئے تاریک کفن

اک ضعیفہ ہے وہاں نوحہ گرِ تنہائی

غمزدہ کاستہ جاں، خستہ دل و سوختہ تن

لب پہ آئی مرے رہ رہ کے یہ فریادِ حزیں

آہ! اے گردشِ ایام، ستمگر، پُر فن

دیکھتے دیکھتے گلشن کو بیاباں کر دے

اِس طرح قصرِ مسرت کو بنا دے مدفن

وائے بر حالِ وطن، وائے بر احوالِ جہاں

یوں جگر سوز ہوا انجامِ محبانِ وطن

ہندی نوجوان سے

محبّت کو، مسرت کو، سُرورِ شادمانی کو
تنعّم کو، تموّل کو، تعیّش کو، جوانی کو
وجاہت کو، امارت کو، وقارِ خاندانی کو
تن آسانی کی خواہش کو نشاطِ زندگانی کو
وطن پر کر دیا قرباں جواہر لال نہرو نے
جواہر لال نہرو بھی جواں ہے اور جواں تو بھی
جواں ہے اور اُمیدِ مادرِ ہندوستاں تو بھی
اسی اُجڑے چمن کا ایک ہے سروِ رواں تو بھی
جوانانِ چمن کے ساتھ ہے وقفِ خزاں تو بھی
کہ سارے باغ کو جھلسا دیا ہے بس بھری لُو نے
تو مسلم ہے کہ ہندو ہے، غرض اس سے نہیں مجھ کو
محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقیں مجھ کو

تری حالت نہ ہو حسرت فزا، یاس آفریں مجھ کو

اگر مل جائے کچھ اس کا جوابِ دل نشیں مجھ کو

کیا ہے کیا وطن کے واسطے اے نوجواں تو نے؟

وطن جس کا ہو پابندِ الم وہ شادماں کیوں ہو

قفس ہو آشیاں جس کا وہ بلبل نغمہ خواں کیوں ہو

غلاموں کا وطن تیرا وطن اے نوجواں کیوں ہو

جہاں آزاد ہے ہندوستاں ننگِ جہاں کیوں ہو

مٹانے کی اسے کیا ٹھان لی چرخِ جفا جو نے؟

حمیّت کا تقاضا ہے کہ ہو کچھ انسداد اس کا

خود آرائی، تن آسانی سے عقدہ وا نہیں ہوگا

سُدلشی، سادگی، پاکیزگی پر ہو عمل پیرا!

جواں مردی وطن کی ہو رہی ہے آج کیوں رُسوا

اسے رُسوا کیا آرائشِ رخسار و گیسو نے

۱۹۳۳ء

گول میز کانفرنس لندن

بھکاری ہیں اور ضد پہ آئے ہوئے ہیں
جو لندن میں دھونی رمائے ہوئے ہیں

چھڑائیں وہ اب کس طرح ان سے دامن!
کہ آخر اُنھی کے بُلائے ہوئے ہیں

نہیں اعتبار اِن کو وعدوں پہ اُن کے
کہ دھوکوں پہ دھوکے یہ کھائے ہوئے ہیں

جو اپنے تھے اپنے وطن کی فضا میں
وہاں جاکے وہ بھی پَرائے ہوئے ہیں

رکھو دل میں صحرا نشیں[1] ایسی باتیں
نہ چھیڑو انھیں یہ ستائے ہوئے ہیں

[1] شاعر کا فرضی نام۔ جس سے اکثر نظمیں اخباروں میں شائع ہوئیں۔

کمیونل اوارڈ

علم و کمال کا نہ لیاقت کا نام لے
محنت سے کام لے، نہ صداقت کا نام لے
ذلت اُٹھائے وہ جو شرافت کا نام لے
مطلوب نوکری ہے تو ملت کا نام لے
ہے دور دورہ آج کمیونل اوارڈ کا
اِس ملک میں ہے راج کمیونل اوارڈ کا

سارے جہاں میں جوہر قابل کی قدر ہے
اہلِ نظر کے دل میں خصائل کی قدر ہے
انسان کے دماغ کی اور دل کی قدر ہے
حق دوست اور دشمنِ باطل کی قدر ہے
لیکن یہاں عمل ہے کمیونل اوارڈ کا
ہر صیغے میں خلل ہے کمیونل اوارڈ کا

نالائقوں کا مرتبہ اس نے بڑھا دیا
سرکردہ فائقوں کو نظر سے گرا دیا
اچھے بُرے کے فرق کو یکسر مٹا دیا
بُلبل کو زاغ، زاغ کو بُلبل بنا دیا
ہے طرفہ انقلاب کمیونل اوارڈ کا
ہندی ہیں اور عذاب کمیونل اوارڈ کا

بھڑکی ہے اس سے فرقہ پرستی کی آگ اور
ہر فرقہ اپنی ڈفلی پہ گاتا ہے راگ اور
ڈھیلی ہوئی سمندِ عداوت کی باگ اور
پھنکارتا ہے آج تعصب کا ناگ اور
ہے اُس کے منہ میں زہر کمیونل اوارڈ کا
ہندی ہیں اور قہر کمیونل اوارڈ کا

کونسل میں ہے جو تلخ نوائی اسی سے ہے
ایوانِ معدلت میں بُرائی اسی سے ہے
بازار میں لڑائی بھڑائی اسی سے ہے
شورش ہر ایک سر میں سمائی اسی سے ہے

سب شورشوں میں زور کمیونل اوارڈ کا
ہر سُو مچا ہے شور کمیونل اوارڈ کا

تعداد میں فریب کی تعلیم، اسی کا شر
ناپاک اور پاک کی تقسیم، اسی کا شر
ہر فی صدی کے کور کی تنظیم، اسی کا شر
گمراہ رہنماؤں کی تعظیم، اسی کا شر
ہر ایک شر میں شر ہے کمیونل اوارڈ کا
ہر عیب میں ہنر ہے کمیونل اوارڈ کا

ہندوستان کو اس سے الٰہی نجات ہو
انصاف و حق ہوں جس سے نمایاں وہ بات ہو
محتاجِ رنگِ فرقہ نہ حُسنِ صفات ہو
ایسی عروسِ صبح کی خالق یہ رات ہو
ہو جس کو عار غازۂ کمیونل اوارڈ کا
یارب، اُٹھے جنازہ کمیونل اوارڈ کا!

کمیونل ایوارڈ

اعلانوں اور فرمانوں سے
بھارت کو خوب ہی جکڑا ہے
پہلے کچھ اور ہی صورت تھی
اب اور طرح سے پکڑا ہے

قیدی کے ہاتھ اور پاؤں میں تھیں
جھوٹے وعدوں کی زنجیریں
تقریروں پر پابندی تھی
تحریروں پر تھیں تعزیریں

رسّی اب فرقہ داری کی
گردن میں اُس کی ڈالی ہے
کس طاقت سے، کس حیلے سے
یہ پھانسی ٹوٹنے والی ہے

ہشیار قلندر مغرب کا
جب ڈُگ ڈُگی اپنی بجائے گا
ناچیں گے ہندو، سکھ، مسلم
جو ناچ یہ ان کو نچائے گا

ہندو مسلمان

ہندو مسلماں، ہیں بھائی بھائی — تفریق کیسی، کیسی لڑائی
ہندو ہو کوئی، یا ہو مسلماں — عزت کے قابل ہے بس وہ انساں
نیکی ہو جس کا کارِ نمایاں — ہستی ہو جس کی تصویرِ احساں
اور راہ کی مشکل ہو جس سے آساں — جس کا عمل ہو اور جس کا ایماں
ہر اک سے نیکی، سب سے بھلائی — ہندو مسلماں، ہیں بھائی بھائی

ہندو مسلماں دونوں برابر — دونوں کی خالق وہ ذات برتر
دونوں اسی کی کرتے ہیں پوجا — در پر اسی کے دونوں جبیں سا
اک آستاں ہے دونوں کا قبلہ — مسجد اُسی کی، مندر اُسی کا
دونوں گھروں میں وہ جلوہ فرما — ہندو نے ایشور اُس کو پکارا

بولا مسلماں، اللہ اکبر　　ہندو مسلماں دونوں برابر

ہندو مسلماں، قومیں پرانی　　دونوں کی دونوں ہندوستانی
دونوں کا مسکن ہندوستاں ہے　　وہ بلبلیں ہیں، یہ گلستاں ہے
اک سرزمیں ہے، اک آسماں ہے　　مدفن وہیں ہے، مولد جہاں ہے
دونوں کا یک جا سود و زیاں ہے　　نا اتفاقی آزارِ جاں ہے
مِل جُل کے رہنا ہے کامرانی　　ہندو مسلماں قومیں پرانی

ہندو مسلماں دونوں مہذب　　امن و اماں ہے دونوں کا مذہب
دونوں کا ایماں امن و اماں ہے　　ہنسا سے نفرت اُس کو جہاں ہے
لَا تُفْسِدُوْا کا یہ ترجماں ہے　　ہندو سے مسلم کیوں سرگراں ہے
مسلم سے ہندو کیوں بدگماں ہے　　دونوں کا دشمن دورِ زماں ہے
دورِ زماں کا ہے اور مطلب　　ہندو مسلماں دونوں مہذب

ہندو مسلماں ہمسائے باہم　　ہمسائیگی کا حق ہے مقدم
ہمسایہ گر ہو وقفِ اذیت　　ہمسائے کو پھر کیوں کرہو راحت

غم دوسرے کا اک کی مصیبت — راحت ہے اِس کی، اُس کو مسرّت
دونوں کو لازم رسمِ مروّت — دونوں کو زیبا ذوقِ محبّت
باہم ہوں دونوں غمخوار و ہمدم — ہندو مسلماں ہمسائے باہم

ہندو مسلماں سوچیں ذرا تو — جھگڑوں سے ناراض ہوگا خدا تو
پھر کس کی خاطر یہ فتنہ و شر — کٹتے ہیں سینے پھٹتے ہیں کیوں سر؟
آمادگی کیوں باتیغ و خنجر — اک دوسرے کی بربادیوں پر؟
دونوں کا جب ہے ہندوستاں گھر — ہوتا ہے کوئی یوں گھر سے باہر؟
گھر جل گیا، یا گھر گر گیا، تو؟ — ہندو مسلماں سوچیں ذرا تو!

ہندو مسلماں کب تک لڑیں گے — نفرت کے جھنڈے کب تک گڑیں گے
خاکِ وطن میں، اے ہند والو! — اُجڑے چمن کے اے نونہالو
گزری گئی پر اب خاک ڈالو — روٹھے دلوں کو باہم ملا لو
حالت سنوارو، بگڑی بنالو — صدق و صفا سے سینے بسالو
کینوں سے خالی کرنا پڑیں گے
ہندو مسلماں کب تک لڑیں گے

دسمبر ۱۹۲۱ء

تضمین

ہند کی تاریخ میں ہم نے پڑھا ہے بارہا
رشکِ فردوسِ بریں یہ خطۂ شاداب تھا
اس کے باشندے تھے حق بیں رحمدل اور باصفا
تھا بہ فیضِ قدرتِ ربِّ کریم اس ملک کا
"ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا"

اس کی حالت آہ لیکن رحم کے قابل ہے آج
ہر بلائے ناگہانی کی یہی منزل ہے آج
انقلابِ دہر سے موجِ کرم ساحل ہے آج
گفتۂ غالب کی ہے تصویر یانِ دل ہے آج
"عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا"

حالِ وطن

وطن کا حال ہے ناگفتنی، کہیئے تو کیا کہیئے
کسے الزام دیجیے، کس کو اچھا یا بُرا کہیئے
پھنسا اس طرح بے بس ہے مُلوکیّت کے پنجے میں
کسی نے کس کے گویا باندھ رکھّا ہے شکنجے میں
رہائی کی کوئی تدبیر چلنے میں نہیں آتی
بُری تقدیر صدیوں سے بدلنے میں نہیں آتی
غریبی، بدنصیبی، تلخ کامی بڑھتی جاتی ہے
وطن کی آہ! میعادِ غلامی بڑھتی جاتی ہے
کرن اُمّید کی طوفانِ استبداد میں گُم ہے
فغانِ صبحگاہی شورِ برق و باد میں گُم ہے

رہا اپنی دعاؤں میں نہ آہوں میں اثر باقی

نہیں خاکسترِ جذبات میں کوئی شرر باقی

یہ ماتم انتزاعِ زندگی کا ہے کہ جینا ہے

یہ عالم "بندگی بیچارگی" کا ہے کہ جینا ہے

رہی خاکِ شہیدانِ وطن بھی بے نشاں ہو کر

مِلا مٹّی میں خونِ بیگناہاں رائیگاں ہو کر

کئی قربانیاں بیکار ہو کر رہ گئیں آخر

ہزاروں حسرتیں لاچار ہو کر رہ گئیں آخر

ہمارے بہتریں انسان پڑے زنداں میں سڑتے ہیں

جو باہر ہیں وہ ہر اک بات پر باہم جھگڑتے ہیں

قفس میں لڑتے ہیں جیسے پرندے دانے دانے پر

معیشت آن پہنچی ہے ہماری اس ٹھکانے پر

ہمارے تفرقوں سے ہنس رہا ہے اک جہاں ہم پہ

سیاست کا جو عالم ہے عیاں ہے ایک عالم پہ

غلامی جوہرِ انسانیت کو مار دیتی ہے

فنا ہوتی ہے خودداری، شرافت ہار دیتی ہے

تدبر ہے ہمارا فرقہ داری، فرقہ آرائی

نحوست کا ستارا، فرقہ واری، فرقہ آرائی

کوئی کہتا ہے پاکستاں ہمیں جب تک نہیں ملتا

ہمیں بربادئ ہندوستاں کی کچھ نہیں پروا

کوئی کہتا ہے تقسیمِ وطن ہونے نہ دیں گے ہم

نزاعِ دائمی کا تخمِ نو بونے نہ دیں گے ہم

غرض ایسے ہی ہنگاموں سے طاقت گھٹتی جاتی ہے

جو اصلی کام ہے اس سے توجہ ہٹتی جاتی ہے

یہی حالات ہیں تو اور بھی بدحال کر دے گی

غلامی ہند کے شہر کو کنگال کر دے گی

نوائے وقت

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں

نازل سرِ آفاق ہوا قہرِ الٰہی
امن اور اماں ہوگئے عدم ہوگئے راہی
منزل گہہِ مہتاب سے تا مسکنِ ماہی
ہیں محوِ عمل سینکڑوں ارکانِ تباہی

جو مُلک ہے برباد ہے بارش سے بموں کی
دنیا میں جو بستی ہے وہ بستی ہے غموں کی

جانباز جواں نذرِ فنا ہوگئے لاکھوں
ماں باپ سے دلبند جدا ہوگئے لاکھوں
معصوم غریب الغربا ہوگئے لاکھوں
مظلوم یتیموں سے سوا ہوگئے لاکھوں

سرتا بقدم نالہ و فریاد ہیں مائیں
بیواؤں کی آہوں سے ہیں معمور فضائیں

یہ جنگ نہیں بلکہ خود آئی ہے قیامت

پیغامِ دِغا دہر میں لائی ہے قیامت

توپوں کی دنا دن نے مچائی ہے قیامت

فولاد کے دیوؤں کی لڑائی ہے قیامت

وہ آگ اُگلتے ہوئے ٹینکوں کی چڑھائی

اک آن میں بستے ہوئے شہروں کی صفائی

محفوظ نہ خشکی نہ تری ہے نہ فضا ہے

بگڑی ہوئی معمورۂ عالم کی ہوا ہے

بارود کے پھٹنے سے زمیں زلزلہ زا ہے

ہنگامۂ محشر سرِ افلاک بپا ہے

منڈلاتے ہیں بمبار قضا بن کے جہاں پر

برساتے ہیں مینہ آگ کا جاندار کی جاں پر

اس آگ نے آرام کسی گھر میں نہ چھوڑا

جینے کا سہارا دلِ مضطر میں نہ چھوڑا

بے داغ نظارا مہ و اختر میں نہ چھوڑا

لوہے کے جہازوں کو سمندر میں نہ چھوڑا

ہم پایۂ فردوسِ بریں تھے جو خیاباں
شعلوں کی لپٹ سے ہوئے جل کر وہ بیاباں

اس آگ سے کچھ دُور جو قطعات زمیں ہیں
وہ بھی اثرِ جنگ سے محفوظ نہیں ہیں

ہے قحط وہاں اور وبائیں بھی وہیں ہیں
ویراں ہیں مکاں اور زبوں حال مکیں ہیں

اچھے رہے مردانہ جو میداں کو سدھارے
کس گنتی میں ہیں مر گئے جو بھوک کے مارے

شانِ کرم، اے خالقِ غفّار دکھا دے
اس آگ کو الطاف کے چھینٹوں سے بجھا دے

ہر بانیِٔ بیداد کی ہستی کو مٹا دے
دے امن و اماں دہر کو اور صدق و صفا دے

اب رحم، کہ رحمت کے سزاوار بہت ہیں
بندے ہیں ترے گرچہ گنہگار بہت ہیں

قحطِ ہند

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں

اے کشورِ ہندوستاں   اے انتخابِ دو جہاں
برسا رہا ہے آسماں   سارے جہاں پر بجلیاں
محفوظ ہر آسیب سے
لیکن ہے تیرا گلستاں

اقطاعِ عالم بیش و کم   ہیں تختۂ مشقِ ستم
پیہم کہیں گرتے ہیں بم   پھٹتے ہیں گولے دمبدم
اور آگ برساتے کہیں
غولانِ آتش ہیں رواں

ہے مہرباں قدرت، مگر اے ہند تیرے حال پر

گلزارِ عالم بیشتر! آتش بجاں، آتش بہ سر

لیکن ہے تیری کشت پر

ابرِ کرم گوہر فشاں

ہمدرد قدرت بھی یہاں انساں کی محنت بھی یہاں

زہد و ریاضت بھی یہاں صبر و قناعت بھی یہاں

ہر سال پھر نازل ہے کیوں

یہ قحط کی لعنت یہاں

یہ بھوک، یہ رنج و تعب لاکھوں، کروڑوں جاں بلب

اتنا ستم، ایسا غضب آخر ہے کیا اس کا سبب؟

اس کا سبب وہ بے بسی

ممکن نہیں جس کا بیاں

قحطِ بنگال

دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر

غلامی میں نہیں ہے اِن سے بچنے کا کوئی چارا
یہ لڑتے ہیں جہاں سے اور ہم پر بوجھ ہے سارا
بجانے کے لئے اپنی جہانگیری کا نقّارا
ہماری کھال کھنچواتے ہیں، دیکھو تو یہ نظّارا
بظاہر ہیں کرم پرور، بباطن ہیں ستم آرا
یہ اپنی ذات کی خاطر ہیں سب کی جان کے دشمن
ہیں خوں آشام ہر حیوان کے انسان کے دشمن
کبھی ہیں چین کے دشمن، کبھی ایران کے دشمن
ہمارے دوست بھی کب ہیں جو ہیں جاپان کے دشمن
اُسے بندوق سے مارا تو ہم کو بھوک سے مارا

قحطِ بنگال

قطعہ

بارشِ بم سے اے وطن، تو جو بچا تو کیا ہوا
قحط و وبا کے تیر ہیں تیرے لئے قضا کے پاس
تیری مصیبتوں کی نذر اشکِ رواں و داغِ دل
اس کے سوا ہے اور کیا شاعرِ بے نوا کے پاس

اشعار

اے مستِ مئے بے خبری، حالِ جہاں دیکھ
سرحدِ فنا ہے یہی، پہنچا ہے کہاں، دیکھ

خونخوار بلائیں ہیں ترے سامنے، غافل

قحط اور وبائیں ہیں ترے سامنے، غافل

کیا اہل وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے

بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے

افسانۂ عبرت ہوئی ویرانیٔ بنگال

مذکورِ کہن ہے چمنستانیٔ بنگال

سڑتی ہیں پڑی کوچہ و بازار میں لاشیں

ہیں نقشِ طرب دیدۂ اغیار میں لاشیں

سفّاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری

یہ جَور ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری

بنکم کے ترانوں کا وطن نالہ کُناں ہے

ٹیگور کے نغموں کا چمن وقفِ خزاں ہے

جس خطّے سے اُٹھّی تھی صدا حُبِ وطن کی

ملتی ہے اُسے آج سزا حُبّ وطن کی

ٹوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیرِ غلامی

اس سے بھی خطرناک ہے تقدیرِ غلامی

ہولی

مسرت کا ہولی جو لائی پیام　　جہاں سُن کے اُس کو ہوا شاد کام
فلک پر شفق رَنگ اُڑانے لگی　　فضا چار سُو مُسکرانے لگی!
ہُوا شہر میں جشن کا اہتمام　　بھرے لالہ و گل نے گلشن میں جام
اِدھر گھر کے ابرِ بہار آ گیا　　اُدھر جُھوم کر بادہ خوار آ گیا

ہیں چاروں طرف عیش کے رَنگ ڈھنگ
مگر دل میں دیکھی نہ کوئی اُمنگ

کہا میں نے دل سے کہ اے نامراد　　کبھی تجھ کو پایا نہ پہلو میں شاد
زمانے سے ہے تیری خو بُو الگ　　کہ رہتا ہے ہر عیش سے تُو الگ

خوشی ہو کوئی، کوئی تیوہار ہو
ہے تصویرِ حسرت ترے روبرو

بپا آج ہولی کا ہنگامہ ہے
کہ ارزانیٔ عشرتِ عامہ ہے

مگر آج بھی تو ہے خلوت نشیں
ترا رازِ غم ہم پہ کھلتا نہیں

گراں دل پہ گزرا یہ میرا خطاب
ہُوا اور بھی مائلِ اضطراب

کہا اُس نے یوں کھینچ کر آہِ سرد
بہ صد حسرت و رنج و افسوس و درد

کہ اے چشمِ ظاہر سے نظارہ بیں
حقیقت پہ تیری نظر ہی نہیں

اگر کھولتا تو ذرا چشم و گوش
نہ بھاتی تجھے عشرتِ نا و نوش

یہ آتی ہے جو چنگ و نے کی صدا
ہے دراصل ماتم تری قوم کا

غلامی میں ہولی مناتے ہیں جو
اسیری میں یوں چہچہاتے ہیں جو

وہ ہیں ماضی و حال سے بیخبر
نہ آئندہ احوال پر ہے نظر

ہوئے پسِ کے خاک اور خوشحال ہیں
سرافراز ہیں گرچہ پامال ہیں

ہوئی عالمِ یاس میں آس گم
غلامی کی ذلت کا احساس گم

نہ دیرینہ عظمت کا اُن کو خیال
نہ موجودہ ذلت سے دل کو ملال

نہ اندیشہ کچھ اُن کو انجام کا
نہ خدشہ انھیں دورِ ایام کا

مناتے ہیں ہولی، یہ گاتے ہیں گیت
چلاتے ہیں اپنے بزرگوں کی ریت

نہیں ہے مگر ان کو اتنی تمیز　　بزرگوں کی ہولی تھی کچھ اور چیز
وہ آزاد تھے اور دلشاد تھے　　مسرّت سے دل اُن کے آباد تھے
وہ حق اور صداقت کے پابند تھے　　حقیقت میں شاد اور خورسند تھے
انھیں زیب دیتا تھا چنگ و سرود　　کہ تھے صاحبِ شان و نام و نمود

وہ تھے سُرخ رُو، اور عبیر و گلال
انہی سُرخ رویوں کے تھے حسبِ حال

مگر ہم غلام اور ابنِ غلام　　کریں اُن کی تقلید کا اہتمام؟
اگر ملک و ملت کے حالات پر　　کریں غور تو صاف آئے نظر
کہ ہم پر ہے عیش و مسرّت حرام　　ہے آسودگی اور راحت حرام
کہیں قحط ہے اور وبا ہے کہیں　　فلک سے نزولِ بلا ہے کہیں
فدا بھوک پر جان کرتے ہیں لوگ　　گلی اور کوچوں میں مرتے ہیں لوگ
کہیں زر پرست اور سرمایہ دار　　غریبوں کی عصمت پہ کرتے ہیں وار
وطن کے فدائی جو ہیں سر دمشد　　پڑے ہیں وہ مجبور زنداں میں بند
غضب ہے کہ ہم آبرو ہار کے　　ہوں وارث بزرگوں کے تیوہار کے
ترانے یہ بیوقت کے راگ ہیں　　لنگوٹی میں ہم کھیلتے پھاگ ہیں
بزرگوں کی عزت ہے ہم میں نہ شان　　نہ وہ زورِ بازو نہ وہ گیان دھیان

وہ مالک تھے خود اپنے دن رات کے
وہ آقا تھے خود اپنے حالات کے

مگر ننگِ اسلاف ہم آج ہیں
کہ بے دست و پا اور محتاج ہیں

عمل میں نہیں اُن کی تقلید اگر
تو کیا حق ہمیں اُن کے تیوہار پر

جو ہولی منانے کا ہے تم کو شوق
تو پیدا کرو دل میں پہلے یہ ذوق

رواں ہوں وطن کے لئے اشکِ خوں
کہ ہو سرزمینِ وطن لالہ گوں

نمایاں ہو پھر اس سے ہولی کا رنگ
ہر اک دل میں پیدا ہو رنگیں اُمنگ

وطن کی محبّت، وطن کا وقار
غلامی سے نفرت، غلامی سے عار

اشعار

فاقہ مستی میں یاد ہے کس کو
مَے و مینا و جام کی ہولی

دل کی رنگینیاں ہوئیں رخصت
رہ گئی اب تو نام کی ہولی

دِل رُبا ہے شفق کی رنگینی
خُوب ہے صبح و شام کی ہولی

نیتاجی

سبھاش چندر بوس

غلامی میں ابتر تھی حالت وطن کی
ہوئی روح فرسا اذیت وطن کی

کہاں چین تجھ سے محبِ وطن کو
لٹیروں نے لُوٹی جو راحت وطن کی

کیا مضطرب تیری غیرت نے تجھ کو
نہ دیکھی گئی تجھ سے ذلت وطن کی

دلِ پُر حمیت سے پاکر اشارا
کیا رنجِ غربت کو تو نے گوارا

وطن کے لئے بے وطن ہو کے نکلا
سراپا اسیرِ محن ہو کے نکلا

وقارِ وطن تجھ سے پھیلا جہاں میں
چمن سے شمیمِ چمن ہو کے نکلا

یہیں راحتِ قصر و ایواں کو چھوڑا
طلبگارِ گور و کفن ہو کے نکلا

ہوئی کارگر تیری تدبیر آخر
کہ ٹوٹی غلامی کی زنجیر آخر

آزادِ ہند فوج

عزیز جگن ناتھ آزاد کی نظم اسی عنوان سے کسی جریدے میں شائع ہوئی۔ ٹیپ کا مصرع مجھے بہت پسند آیا۔ اسی کو لے کر یہ چند بند موزوں ہوگئے۔ دونوں نظمیں اس وقت کہی گئیں جب یہ فوج ابھی برما میں مصروفِ عمل تھی۔

اے جیشِ سرفروشِ جوانانِ خوش نہاد
سینے پہ تیرے کُند ہوئی تیغِ استبداد
غربت میں تو نے دی ہے شجاعت کی خوب داد
اقوامِ دہر کرتی ہیں جرأت پہ تیری صاد
تو کامراں رہے، ترے دشمن ہوں نامراد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

دریا و دشت و کوہ میں تیرا بگل بجے
جس کی صدا سے گنبدِ گردوں بھی گونج اُٹھے

میداں میں موت بھی جو مجسم ہو سامنے
تیرے دلاوروں کے نہ ہوں پست حوصلے
ہو بلکہ اُن کا اور بھی جوشِ عمل زیاد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

پردیس میں جو کھیت رہے ہیں جواں ترے
ہیں دفن زیرِ خاک خزانے وہاں ترے
برما کے جنگلوں میں لہو کے نشاں ترے
نقشِ دوام ہیں وہ بہ زیرِ آسماں ترے
تا روزِ حشر اہلِ وطن کو رہیں گے یاد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

آزادیٔ وطن کی تمنائے دل نواز
زنداں میں گھُٹ کے رہ گئی، یا دل میں مثلِ راز
کہتے تھے جرم جس کو حکومت کے حیلہ ساز
تیرے عمل سے اُس کو ملی خلعتِ جواز
اب حق ہے جس کا نام رہا "غدر اور فساد"
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

غالب تھا بسکہ ساحرِ افرنگ کا فسوں

دو سو برس سے تھا عَلَمِ ہند سرنگوں

تو نے دیارِ غیر میں دکھلا دیا کہ یوں

مردانِ کار کرتے ہیں باطل کو غرقِ خوں

باطل ہو خواہ کوہِ گراں، خواہ گرد باد

"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

حملہ آور

جب کسی ملک کی چھاتی پہ چڑھ آتا ہے غنیم
دونوں ہاتھوں سے گلا اس کا دباتا ہے غنیم
بجلیاں قہر کی ہنس ہنس کے گراتا ہے غنیم
غرض آثار قیامت کے دکھاتا ہے غنیم

ٹوٹ پڑتا ہے زر و مال پہ ڈاکو بن کر!
ننگ و ناموس پہ گرتا ہے ہلاکو بن کر
قتلِ انساں سے نہ جب تک کہ ہو گلرنگ زمیں
حملہ آور کو نہیں ہوتی ہے حاصل تسکیں
اس کو ہر منظرِ خونیں ہے بہارِ رنگیں
دامنِ آز کی کرتا ہے لہو سے تزئیں

اس سے ہو سکتی ہے کیا مہر و وفا کی اُمید
دشمنِ حق سے ہو کیا صدق و صفا کی اُمید

ہر قدم پر جو روا دارِ جفا ہوتا ہے
وہ کہاں مائلِ اندازِ وفا ہوتا ہے

شرمِ خلقت نہ اُسے خوفِ خدا ہوتا ہے

خون کا چسکا جو پڑ جائے بُرا ہوتا ہے

قتل و غارت کے سوا اور اُسے کیا آتا ہے

اہلِ عالم کی تباہی میں مزا آتا ہے

نذرِ آتش ہوں اگر بستے ہوئے شہر، وہ خوش

بند پانی کی ہو محصور پر گر نہر، وہ خوش

آسمانوں سے برستا ہے اگر قہر، وہ خوش

اپنی غیرت سے جو کھاتا ہے کوئی زہر، وہ خوش

بے اثر نالہ و فریاد ہیں اس کے آگے

خوش ہے، مظلوم جو ناشاد ہیں اس کے آگے

حملہ آور کے لیے خونِ بشر پانی ہے!

اس کی فطرت میں ہوس اور ستم رانی ہے

ماضی و حال میں اک فطرتِ انسانی ہے

جو خلاف اس کے ہے اُمید تو نادانی ہے

اپنی سرحد سے اسے دُور ہی رکھنا بہتر

اس کے اعمالِ زبوں کو نہ پرکھنا بہتر

وطن کے سپاہی

وطن کے سپاہی دلاور بڑے ہیں
تباہی مچادی جہاں جا پڑے ہیں
یہ جانباز جس مورچے پر لڑے ہیں
وہیں ان کی شہرت کے جھنڈے گڑے ہیں

ازل سے یہ ہیں خوگرِ سر فروشی
سراپا وفا پیکرِ سر فروشی

سبق جو پڑھایا انھیں، پڑھ گئے یہ
کہا ان کو جس ملک پر، چڑھ گئے یہ
بڑھایا جدھر کو، اُدھر بڑھ گئے یہ
گڑھے پھاند کر، توڑ کر گڑھ گئے یہ

نہ بم سے جھجکنا، نہ توپوں سے ڈرنا
انھیں کھیل ہے مارنا اور مرنا

کبھی چین میں چینیوں کو دبایا
کبھی دُور سے روسیوں کو ڈرایا
کبھی جاکے کابل میں سکہ بٹھایا
کبھی کر دیا جرمنی کا صفایا

عراق عرب میں کبھی دندنائے
کبھی جاکے افریقہ کو روند آئے

قدمبوس اُن کی ہوئی خاکِ ایراں
فرانسیس اِن کے تہوّر پہ قرباں
کیا اُن کی یُورش نے اٹلی کو ویراں
ہوا اُن کی ہیبت سے جاپان بے جاں

غرض ایک عالم میں ہے دُھوم اِن کی
ثنا دفتروں میں ہے مرقوم اِن کی

مگر ان سے پوچھے کوئی، اے یگانو!
زمینِ شجاعت کے اے آسمانو!
کبھی کی ہے کوشش کہ تم یہ بھی جانو!
تمھارا وطن کس لئے اے جوانو!

اسیرِ مصیبت، رہینِ بلا ہے
غلامی کے پھندوں میں جکڑا ہوا ہے

مُبارک باد

دوسری جنگِ عظیم میں انگریزوں کی فتحیابی پر

یہ فتح تم کو مبارک، مگر ہمیں کب تک
رہینِ بیم و رجا زیرِ دام رکھنا ہے
یہ فتح تم کو مبارک، ہمارے آقاؤ
کہو کہ اب ہمیں کب تک غُلام رکھنا ہے

یہ فتح تم کو مبارک، مگر بڑھیں نہ کہیں
گھٹائیں جانبِ بنگال پھر نحوست[1] کی
فضائے دل میں پہنچتی نہیں ہیں وہ ہرگز
صدائیں کانوں میں آتی ہیں جو مسرت کی

[1] قحطِ بنگال کی طرف اشارہ ہے

یہ فتح تم کو مبارک، مگر ہمارے دل
ہجومِ غم میں شکست آشنا ہیں مدّت سے
تمھارے سر سے تو آئی بلا ٹلی، لیکن
اِدھر بھی دیکھو کہ وقفِ بلا ہیں مدّت سے

یہ فتح تم کو مبارک، کہ سرفراز ہو تم
ہم اس پہ اس لئے خوش ہوں کہ سرنگوں ہیں ہم؟
خجستہ کام و ظفریاب و کامراں ہو تم
خراب و خستہ، زبوں حال و بدشگوں ہیں ہم

یہ فتح تم کو مبارک کہ جس سے شکریہ
بلاکشوں کا[1]، تمھاری زباں پہ آیا ہے
نہیں رہی کشش اب کوئی اس فسانے میں
کہ تم نے پہلے کئی بار یہ سنایا ہے

[1] فتح یابی کے بعد انگلستان نے سرکاری طور پر ہندوستان کا شکریہ ادا کیا تھا۔

برطانیہ کا لکچر ہندوستانی سپاہیوں کے سامنے

شاباش، بہادرو، دلیرو — میدانِ محاربہ کے شیرو
فی النار ہوا ہے ایک[1] دشمن — باقی ہے ابھی اِک[2] اور پُرفن
اس سے بھی زیادہ سخت جاں ہے — خونخوار، عدوّئے این و آں ہے
پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ — دکھلاؤ بہادری کے تم ہاتھ
پہلے سے بہت زیادہ جرأت — پہلے سے بہت فزوں شجاعت
پہلے سے زیادہ ساز و ساماں — پہلے سے بہت زیادہ انساں
پہلے سے زیادہ قتل و غارت — مکر و فن و حیلہ و جسارت
پہلے سے زیادہ قحط سالی — پہلے سے سوا خراب حالی

[1] جرمنی [2] جاپان

پہلے سے زیادہ بدگمانی — پہلے سے زیادہ سرگرانی
پہلے سے بہت زیادہ نایاب — زندہ رہنے کے جملہ اسباب
پہلے سے زیادہ شورِ ماتم — پہلے سے زیادہ گریۂ غم
پہلے سے بہت کڑے قوانیں — پہلے سے بُرے بُرے قوانیں
پہلے سے بہت یتیم بے بس — پہلے سے زیادہ لوگ بے کس

بعد اس کے تمام خیر سلا!
مارو گے جو دم تو مارشل لا!

رفاقت

رفاقت ہے مہرِ ضیا بارِ ہستی — رفاقت سے روشن شبستانِ ہستی
رفاقت سے شاداب گلزارِ ہستی — گلِ تر رفاقت سے ہر خارِ ہستی
غم و رنج و اندوہ و کلفت کی دنیا
رفاقت سے بنتی ہے فرحت کی دنیا

رفاقت سے ہوتے ہیں افراد نامی — رفاقت سے ہوتی ہے ملت گرامی
رفاقت سے کھلتے ہیں بندِ غلامی — رفاقت ہے سرمایۂ شادکامی
رفاقت ہے شیرازہ بندی وطن کی
رفاقت میں ہے دردمندی وطن کی

رفاقت نہیں ہے تو رنج و تعب ہے | رفاقت نہیں ہے تو غیظ و غضب ہے
رفاقت ہمیشہ تبسم بہ لب ہے | رفاقت کا عالم جہانِ طرب ہے

رفاقت سے صحرا میں صورت چمن کی
رفاقت سے غربت میں راحت وطن کی

رفاقت کو اہلِ وطن نے بھلایا | تو پھل اس کا فتنوں کی صورت میں پایا
عبث آتشِ کیں سے دل کو جلایا | کوئی ان سے پوچھے کہ کیا ہاتھ آیا

جہاں میں کہیں اپنی عزت نہیں ہے
زمانے کی نظروں میں وقعت نہیں ہے

اگر شاہراہِ رفاقت پہ ہولیں | گرہ دل میں جو پڑ گئی اس کو کھولیں
دلوں سے عداوت کے داغوں کو دھولیں | کبھی بھول کر بول کڑوا نہ بولیں

تو ہرگز کٹھن ہو نہ منزل ہماری
ہو آسان ہر ایک مشکل ہماری

راہبرِ راہِ رفاقت

جو نفس کے دیوانے ہیں لڑتے ہیں وہ باہم
پرخاش کی حامل نہیں مذہب کی صداقت

قائل نہ ہو جس کا دلِ بیزارِ برہمن
کس کام کی اے حضرتِ واعظ وہ طلاقت

دل شیخ کا تاثیر سے جس کی نہ پسیجے
پنڈت جی مہاراج کتھا ہے وہ حماقت

اخلاق کے پتلے تھے یہیں مُسلم و ہندو
جب تک اُنھیں ملتی رہی تعلیمِ لیاقت

اے اہلِ وطن اس سے کوئی کام نکلتا
آپس کی لڑائی سے جو ضائع ہوئی طاقت

ممکن ہے بہے ہند میں پھر پریم کی گنگا!
پنجاب اب ہوا راہبرِ راہِ رفاقت

غزل

بسنت کی تقریب پر

محرومؔ، وطن جب تک آزاد نہیں ہوتا
سو بار بسنت آئے، دل شاد نہیں ہوتا

اس باغ کو اے گلچیں تاراج کیا تو نے
برباد ہوا ایسا، آباد نہیں ہوتا

مرغانِ چمن گائیں کیا نغمۂ آزادی
نظروں سے نہاں جب تک صیّاد نہیں ہوتا

یہ شامِ غریباں ہے یا صبحِ وطن اپنی
ہم سا کوئی دنیا میں برباد نہیں ہوتا

دل شاد نہیں ہوتا ایّامِ طرب میں بھی
محرومؔ، وطن جب تک آزاد نہیں ہوتا

یادِ اتحّاد

کل تک تھے جان و دل سے جو خواہانِ اتحاد
بیٹھے ہیں آج توڑ کے پیمانِ اتحّاد

ہے دل میں اُن کے آج تمنّائے افتراق
کل تک تھے جن کے پہلو میں ارمانِ اتحّاد

حیرت اس انقلاب پہ ہے دل کو اے خدا
شیدائے بغض وکیں ہیں محبّانِ اتحّاد

شیخ اور برہمن میں کشاکش ہے زور کی
اور اس سے پُرزے پُرزے ہے دامانِ اتحّاد

سینچا گیا تھا خونِ شہیداں سے جو کبھی!
تاراج ہوگیا وہ خیابانِ اتحّاد

شامِ فراق کی ہے اُداسی برس رہی
سُونی پڑی ہے آہ شبستانِ اتحّاد

تاریک مثلِ کوچۂ گیسو ہوا یہ مُلک!
جب سے نہاں ہوا رُخِ تابانِ اتحّاد

ہے بڑھتی جا رہی شبِ بختِ سیاہِ ہند
یارب کدھر ہے نیّرِ رخشانِ اتّحاد

اے اہلِ ہند! کچھ تو کرو ان کا پاس تم
جو سرفروش ہو گئے قربانِ اتّحاد

زندانِ تنگ و تار میں ہیں وقفِ سوزِ غم
وہ جن سے تھا فروغِ نمایانِ اتّحاد

اُن کی شبانہ روز کی محنت سے جو بنا
تم نے گرا دیا ہے وہ ایوانِ اتّحاد

عیّاریوں پہ اپنی ہیں دلشاد راہزن!
اور تم لُٹا کے بیٹھے ہو سامانِ اتّحاد

ہاں، اتّحاد ہے سببِ شوکتِ وطن
لِلّٰہ پھر دکھا دو وہی شانِ اتّحاد

کینے بُھلا کے ہندو و مُسلم گلے ملیں!
پھر کاش آئے ہند میں دورانِ اتّحاد

محروم ہم بھی کرتے ہیں اہلِ وطن کی نذر
یہ چند شعر لکھ کے بہ عنوانِ اتّحاد

آزاد ہند فوج کے جنرل شاہنواز اور چند اور افسر جنوری ۱۹۴۶ء میں راولپنڈی
تشریف لائے۔ اُن کے اعزاز میں یہ نظم موزوں ہوئی۔ (محروم)

مرحبا اے سرفروشانِ وطن، صد مرحبا
اے فروغِ چشمِ حیرانِ وطن، صد مرحبا
فرش اپنے دیدہ و دل ہیں تمھاری راہ میں
آج تم آنکھوں میں ہو، تم دل کی خلوت گاہ میں
دیکھ کر تم کو وطن مسرور ہے، دل شاد ہے
حلقۂ طوقِ غلامی اب کہاں ؟ آزاد ہے !
اک اُجالا سا نظر آتا ہے، جب سے آئے ہو :
شمعِ روشن بزمِ تاریکِ وطن میں لائے ہو

ہر رگ و پے میں تمہارے سوزِ دل کا ہے اثر

شعلۂ حبِ وطن بھڑکا ہے تم کو دیکھ کر

ہر زباں پر نعرۂ مستانہ ہے "جے ہند" کا

رُوح پرور نعرۂ مستانہ ہے "جے ہند" کا

ہند کے چھوٹے بڑے "جے ہند" کے دلدادہ ہیں

جنگِ آزادی میں جاں دینے پہ سب آمادہ ہیں

پھر شرر افشاں ہوئی ہے ہند کی افسردہ خاک

جگمگا اٹھی ہے مَقدَم سے تمہارے مُردہ خاک

آ گئی ہے لوٹ کر صدیوں کے بے جانوں میں جان

ڈال دی ہے تم نے آزادی کے ارمانوں میں جان

جو محبانِ وطن مارے گئے یا مر گئے

حسرتِ آزادیِ ہندوستان لے کر گئے

شاد ہوں گی اُن کی رُوحیں عالمِ بالا میں آج

آرزو ہوگی کہ واپس آئیں پھر دنیا میں آج

واپس آئیں اور بارش تم پہ پھولوں کی کریں

گیت آزادی کے گائیں جشنِ استقبال میں

اے شجاعو! اے دلیرو! اے جوانو! مرحبا
اے وطن کی آبرو کے پاسبانو! مرحبا
اے بہارِ رفتہ کے رنگیں فسانو! مرحبا
مرحبا اُجڑے چمن کے باغبانو! مرحبا
تیاگ بُدھ کا، گیان ارجن کا تمھیں حق نے دیا
عزمِ حیدر اور ایثارِ شہیدِ کربلا
ولولے پرتاپ کے، دل اور جگر دشمیش کا
الغرض ہر وصف احرارِ صداقت کیش کا
ورنہ ایسی آگ میں پڑنا کوئی آساں نہ تھا
انقلابِ دَور کا اس دَور میں امکاں نہ تھا
ذہن پر، دل پر غلامی کی پڑی زنجیر تھی
تم نے توڑا ہے جسے شیرو! کڑی زنجیر تھی
آگ میں کُودے ہو تم اور بن کے کُندن آئے ہو
موت سے لڑ کر وطن کی زندگانی لائے ہو
ہند رہ سکتا نہیں ہے اب غلاموں کا وطن
نامرادوں، بدنصیبوں، تلخ کاموں کا وطن

پیٹ کے بل ہم بہت رینگے ہیں کیڑوں کی طرح
لاٹھیاں بھی، گولیاں بھی کھائی ہیں اچھی طرح
ہم رہیں گے کیا ہمیشہ کے لئے خوار و ذلیل
اور سمجھے جائیں گے اقطاعِ عالم میں رذیل
اب تو ہم اس ذلت افزا زندگی سے تنگ ہیں
جھٹکے احساسِ غلامی کے جنوں آہنگ ہیں
اب اگر جینا ہے تو جینا ہے آزادی کے ساتھ
جنگ ہے اپنی غلامی اور بربادی کے ساتھ
یا غلامی اور بربادی کا ہوگا خاتمہ
یا ہماری بے حمیت زندگی کا خاتمہ!

پنجاب ہمارا

۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن سے کچھ پہلے کہی گئی

ہوتا ہے وطن یوں تو ہر اک شخص کو پیارا
لیکن ہے حقیقت میں دل آویز و دل آرا
پنجاب ہمارا

دریائے رواں، سبزہ و گل، وادی و کہسار
ایسے ہی نظاروں سے ہے فردوسِ نظارا
پنجاب ہمارا

کھیتوں کی یہ وسعت، یہ کسانوں کی کمائی
ان دونوں سے ہے ہند کے جینے کا سہارا
پنجاب ہمارا

جوہر ہیں یہاں حسن و شجاعت کے درخشاں
ہے رشکِ صفاہان و سمرقند و بخارا
پنجاب ہمارا
ہیں گلشنِ آفاق میں گر پھول ممالک
لاریب ہے خوش رنگ و سرافراز ہزارا
پنجاب ہمارا

بگڑے ہوئے پنجاب سے

آدمیت کے لباسِ برتری کو پھاڑ کر

شوقِ عریانی میں یہ رقصِ جنوں، اے فتنہ گر!

تو نے اپنی بربریت کے دکھائے وہ ہنر

خاک میں جن سے ملی توقیرِ انساں سر بہ سر

آسمانوں سے صدا آئے گی یہ شام و سحر

حیف اے پنجاب تجھ پر، اور تری تہذیب پر

شب کی تاریکی میں بن کر بھوت اور خانہ خراب

شیطنت کی پی کے نکلا گھر سے تو اپنے شراب

لوٹ مار، آتش زنی میں، ہو کے آخر کامیاب

کر دیا جلتے مکانوں میں مکینوں کو کباب

بن گئے اپنے مکینوں کے لئے شمشان گھر

حیف اے پنجاب تجھ پر، اور تری تہذیب پر

الاماں، دیہات میں منظر وہ قتلِ عام کا

لوٹ سے تیری نہ عصمت اور نہ مال و زر بچا

رحم تو نے عورتوں پر اور نہ بچوں پر کیا
تشنۂ خوں کب سے تھا اے سنگدل خنجر ترا
کر دیا تو نے نظامِ زندگی زیر و زبر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

آج تک دیکھی سنی ہے کس نے ایسی سرزمیں
بیگناہوں، امن خواہوں کو اماں جس میں نہیں
چیر ڈالیں شیر خواروں کے جگر ارباب کیں
بھون ڈالے جائیں یوں اپنے مکانوں میں مکیں
اس شقاوت کو شجاعت نام دیں ازراہِ شر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

کیا اسی مصرف کو تھے یہ خنجر و تیغ و تفنگ
گھر میں چوری سے ترا رکھا ہوا سامانِ جنگ
تو نے میداں زندگی کا اپنے ہمسایوں پہ تنگ
اپنی نیت سے کیا ہے یا بہ ایمائے فرنگ
لائقِ نفریں بہر صورت ہے، قصہ مختصر!
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

راولپنڈی۔ مارچ ۱۹۴۷ء

اہلِ وطن کی خدمت میں

ہند کے ہندوؤ، مسلمانو! — عقل سے کام لو، کہا مانو

فرضِ ہمسائگی کو مت بھولو — اپنی کم مائگی کو مت بھولو

یوں نہ اک دوسرے پہ وار کرو — فائدہ کیا کہ مار دو اور مرو

ستمِ ناروا سے کام لیا — اور مذہب کا اس میں نام لیا

اس سے مذہب بھی ہوگیا بدنام — اور ہوئے تم بھی موردِ الزام

ساری دنیا میں ہوگئے رسوا — ہے مقدّر یہی غلاموں کا

نہ یہ مذہب ہے، نے سیاست ہے — بربرّیت ہے اور وحشت ہے

گھر سے نکلو، گھروں کو آگ لگاؤ — بیکسوں، بےبسوں کو اس میں جلاؤ

بے گناہوں کو راہ چلتوں کو　　گھیر لو اور ذبح کر ڈالو
چیختی عورتوں پہ وار کرو　　نیزے بچوں کے دل سے پار کرو
کیا یہی جوہرِ آدمیت ہے؟　　یہی مذہب؟ یہی شرافت ہے؟

کیا اہنسا کی ہے یہی تعبیر؟
یہی "لاتُفسِدُوا" کی ہے تفسیر؟

ختم اک دوسرے کو کرنے کا　　عزم بے جا اگر ہے تم نے کیا
تو یہ سمجھو کہ وہم ہے یکسر　　خللِ عقل و فہم ہے یکسر
ختم ہوگی نہ ملتِ اسلام　　اور نہ ہندو کا مٹ سکے گا نام
مگر اس کا مآل یہ ہوگا　　بیج بویا ہوا عداوت کا
پھوٹ کر ہوگا باعثِ آزار　　اک تناور درخت آخرِ کار
کینہ و بغض کا ثمر دے گا　　زندگی سب کی تلخ کر دے گا

کھاؤ گے اس شجر کا پھل برسوں
اور پاؤ گے تم نہ کل برسوں

راولپنڈی　　مارچ ۱۹۴۷ء

پنجاب کی آبرو

افسوس! وطن کی سرزمیں پر — نازل ہے عذابِ آسمانی
نایاب ہوا ہے، بلکہ موہوم — اس دور میں لُطفِ زندگانی
کمیاب ہوئے ہیں بلکہ معدوم — اوقاتِ عزیزِ شادمانی
خالی ہُوئے اعتماد سے دل — نظریں ہیں رہینِ بدگُمانی
معمُور ہوئے فساد سے دل — احباب ہیں وقفِ سرگرانی
ہر بات میں زہر کی ملاوٹ — ہر گھات میں مرگِ ناگہانی
ہر راہ میں اک نئی رُکاوٹ — ہر گام اسیرِ پاسبانی

کیا صِدق و صفا کے اپنے دعوے — سب لاف و گزاف تھے زبانی؟
کیا مہر و وفا کے اپنے وعدے — تھے مکر و ریا کی ترجمانی؟
کیا لطف و کرم کی ہر روایت — جھوٹا قصہ تھی یا کہانی؟
اِخلاصِ بہم کی ہر حکایت — تھی بغض و عناد کی نشانی؟
اے خاکِ وطن ہوں اس پہ نادم — کی میں نے جو تیری مدح خوانی
حیرت ترے حال پر ہے دل کو — رخصت ہوئی طبع کی روانی
آتا ہے زباں پہ اب تو یہ شعر — آئینۂ شکوہ ہے نہانی

پنجاب کی آبرو پہ پھیرا
آپس کی لڑائیوں نے پانی

راولپنڈی جنوری ۱۹۴۱ء

انگریز کے ارادے

ہندوستان چھوڑنے سے پہلے

ابھی ہے اِس میں جاں، گو نیم جاں ہے
ابھی یہ صاحبِ تاب و تواں ہے
ابھی اس کی زبانِ شکوۂ جور
جو کھلتی ہے تو کھل جاتی ہے بے طور
نہ ہوتا خوں اگر اس کے جگر میں
ہوائے حرّیت ہوتی نہ سر میں
ابھی تک یہ ہوا سر میں بھری ہے
ابھی اس کو جنونِ برتری ہے
زباں پر نالہ و فریاد بھی ہے
پُرانی عظمتوں کی یاد بھی ہے

ابھی باقی ہے خوں اس میں، نہ چھوڑو!
نچوڑو، اور بھی اِس کو نچوڑو

جے ہند

پیدا اُفقِ ہند سے ہیں صُبح کے آثار
ہے منزلِ آخر میں غُلامی کی شبِ تار
آمدِ سحرِ نَو کی مبارک ہو وطن کو
پامالِ محن کو!

مشرق میں ضیا ریز ہوا صُبح کا تارا
فرخندہ و تابندہ و جاں بخش و دل آرا
روشن ہوئے جاتے ہیں در و بامِ وطن کے
زندانِ کہن کے!

جے ہند کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے
جے ہند کی عالم میں صدا گونج رہی ہے
یہ ولولہ یہ جوش یہ طوفان مبارک
ہر آن مبارک!

اہلِ وطن! آپس میں اُلجھنے کا نہیں وقت
ایسا نہ ہو غفلت میں گزر جائے کہیں وقت
لازم ہے کہ منزل کے نشاں پر ہوں نگاہیں
پُرپیچ ہیں راہیں!

وہ سامنے آزادیٔ کامل کا نشاں ہے
مقصود وہی ہے، وہی منزل کا نشاں ہے
درکار ہے ہمت کا سہارا کوئی دم اور
دو چار قدم اور!

توفیق مُجھ کو میرے خُدا ہو عطا کہ میں

جان اور دل سے خدمتِ اہلِ وطن کروں

جب آئے کوئی تازہ مصیبت تو جھیل لوں

ہرگز نہ مَیں شکایتِ چرخِ کُہن کروں

جس پر ہو ناز میرے وطن، میری قوم کو

شیوہ وہ اختیار کروں، وہ چلن کروں

خُونِ جگر سے نخلِ وفا کو کروں نہال

پھُولوں سے اُس کے اپنے وطن کو چمن کروں

تھا نازشِ جہاں کبھی پیارا وطن مرا

اب کیوں نہیں ہے پھر اسے فخرِ زمن کروں!

قطعات

قوم اور وطن

ہر ایک قوم ہے اپنے وطن سے وابستہ
ہیں جس طرح گل و بلبل چمن سے وابستہ
وطن بغیر خیالی ہے قوم کی ہستی
ظہورِ جانِ گرامی ہے تن سے وابستہ

گفتار و کردار

بابو سریندر ناتھ گرجتے تھے مثلِ شیر
جس دور میں تھی حبِ وطن اک زباں کی بات
ٹوٹے فصاحت اور بلاغت کے سب طلسم
گاندھی نے آکے چھیڑ دی جب امتحاں کی بات

اکسٹرمسٹ اور ماڈریٹ

کچھ عرصہ پہلے اکسٹرمسٹ تھے جو لوگ
اب گردشِ زمانہ سے وہ ماڈریٹ ہیں
فطرت کے برخلاف ہے یہ ارتقا، مگر
پہلے وطن کا دل تھے، وہ اب محض پیٹ ہیں

نیا دَور

ہر عہد میں حرام رہی مے کشی، مگر
اس عہد میں ممانعتِ مے حرام ہے
مقصد حضور کا نہیں آتا سمجھ میں کچھ
حامی اُسی کے آپ ہیں جو شے حرام ہے

محبانِ وطن کی گرفتاری پر

سرزمینِ ہند میں اب شہر ویرانہ ہے ایک

فخرِ آبادی جو تھے نظروں سے پنہاں ہوگئے

انقلابِ دہر نے کیسا دکھایا ہے یہ دَور

شہر ویراں ہوگئے، آباد زنداں ہوگئے

شہیدانِ جلیانوالہ

ستم کشانِ وطن اب وہ وقت آپہنچا

کہ دل ہو وقفِ الم، لب رہینِ نالہ رہے

نصیبِ گُل کو ہو جب تک کہ چاک دامانی

چمن میں سوختہ جب تک درونِ لالہ رہے

دلوں میں یاد رہے کشتگانِ ہجرت کی

جگر میں داغِ شہیدانِ جلیانوالہ رہے

شہیدانِ وطن

سحر و شام دکھاتا ہے فلک رنگِ شفق
کہ تجھے خونِ شہیدانِ وطن یاد رہے
فرحت افشاں وہ سبک روح رہے مثلِ شمیم
گرچہ خود گلشنِ آفاق میں برباد رہے
حلقۂ دام سے مرغانِ ہوا چھوٹ گئے
ہاتھ ملتے غم و اندوہ میں صیاد رہے

سنگھٹن اور تنظیم

سنگھٹن اِدھر سے ہو رہا ہے — تنظیم اُدھر سے ہو رہی ہے
بھارت ماتا، غریب بیکس — اپنی قسمت کو رو رہی ہے

قفس یا وطن

افسردہ ہے دل بہار میں بھی ۔۔۔ تاراجِ خزاں چمن ہے اپنا

بلبل ہے ترانہ سنج تو کیا ۔۔۔ نالاں ہر موئے تن ہے اپنا

آ، اے ابرِ بہار تو بھی رو لے ۔۔۔ ہمدردِ غم و محن ہے اپنا

دم گھٹنے میں کیا کسر ہے باقی

مانندِ قفس وطن ہے اپنا

بزرگانِ سلف اور ہم

(ترجمہ از انگریزی)

ہمارے اجداد جو مدبّر تھے اور مالک تھے بحر و بر کے
زمانے بھر میں وہ مُقتدر تھے، جہاں میں تھا حکمِ عام ان کا
جسے وہ جب چاہتے اُٹھاتے، جسے جہاں چاہتے گراتے
اہم فرائض ہے نام جن کا، وہ کرتے خود انتظام ان کا
مگر یہ ہم ہیں کہ کرچکے ہیں حقوقِ خاکِ وطن کو زائل
کریں گی کیا فخر اپنی نسلیں، ڈبو دیا ہم نے نام اُن کا
ہوئے ہیں اہلِ وطن گداگر نہیں ہے پوشیدہ حالِ ابتر
ابھی مگر جستجوئے تفریح میں ہے سودائے خام اُن کا

ایضاً

ہمارے ہی بزرگانِ سلف تھے — بلاکش، نفس کُش، ایثار پیکر
ہوئے ہم ننگِ ملت، وائے افسوس — تن آساں، خود غرض اور نفس پرور
جہاں انوار سے تھا اُن کے روشن
ہمارا حال ہے روشن جہاں پر

بھگت سنگھ زندہ باد

بابِ قبول بند رہا، اہلِ ہند نے
مانگی بہت دعا کہ، بھگت سنگھ زندہ باد
مایوس بارگاہِ رعونت سے آگئی
گاندھی کی التجا کہ، بھگت سنگھ زندہ باد
پنجاب کی فضاؤں سے محروم آج تک
آتی ہے یہ صدا کہ بھگت سنگھ زندہ باد!

دِل اور زبان

کل میکدے میں پُوچھا پیرِ مغاں سے مین نے
بُت خانہ اور مسجد نزدیک ہیں یہاں سے
گُلبانگ میکشوں کی، رِندوں کا شور و غوغا
ہے گونجتا فضا میں ٹکرا کے آسمان سے
مسجد کے سجدہ آرا، بُت خانے کے پجاری
چِڑتے نہیں ذرا بھی غوغائے میکشاں سے
ہو جاتے ہیں وہ لیکن باہم چھُری کٹاری
ناقوس کی صدا سے، آوازۂ اذاں سے

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا"

یہ خود سُنا ہے میں نے اقبالِ خوش بیاں سے

یہ لوگ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں

یا سہو ہو گئی ہے فطرت کے ترجماں سے

رُوداد سُن کے میری وہ پیرِ مرد بولا

آئینِ وعظ و حکمت ہے دُور اس مکاں سے

کہتا ہوں تجھ سے لیکن رندوں کا ایک نکتہ

جو سر بہ سر ہے عاری آرائشِ بیاں سے

دل میں ہو یا عمل میں، مذہب ہے امنِ عالم

یکسر فساد، اگر ہو ظاہر فقط زباں سے

منزل
حصولِ آزادی کے بعد

پاکستان کو اَلوِداع

رُباعی

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محروم　　ما من پیشِ نظر، نہ منزل معلوم
ہنگامِ وداع ہم نے دیکھا اس کو　　حسرت زدہ، دل شکستہ، حیران مغموم

نظم

اَے مرے پیارے وطن، میرے بزرگوں کے وطن
اَے مری راحت کی دُنیا، اے مرے اچھے وطن
عُمر بھر تیری وفاداری کا دم بھرتا رہا
مدح تیری شعر میں زیبِ رقم کرتا رہا
مشغلہ میرا رہا علم و ادب شعر و سخن
اور سمجھا میں اسی کو خدمتِ اہلِ وطن
حرصِ دنیا سے رہا یک سو دلِ دانش پذیر
ننگِ تن میرے لئے تھا ذوقِ دیبا و حریر

تو نے لیکن اے وطن، مجھ کو دیا انعام خوب

زندگی کے دورِ آخر میں ہوا انجام خوب

آہٹ آزادی کی پاکر ہو گیا دیوانہ تو

آدمیّت کی فضیلت سے ہوا بیگانہ تو

ہو گیا رقصِ جنوں میں آہ! کتنا بے خبر

جامۂ تہذیب پھینکا تن سے اپنے پھاڑ کر

لیگ کا یومِ عمل بنگال سے آیا یہاں

ساتھ اپنے محشرستانِ ستم لایا یہاں

نام پر مذہب کے ہر فعلِ زبوں ہونے لگا

گرم بازارِ فساد و کشت و خوں ہونے لگا

یک بہ یک آبادیوں سے آگ کے شعلے اٹھے

خون کے پیاسوں کے لشکر قریہ قریہ سے اٹھے

جو تصور میں نہ تھے، فتنے وہ برپا ہو گئے

چار سُو شمشیر و خنجر کارفرما ہو گئے

حق سے بے رُخ کر دیا انگریز کی تدبیر نے

آدمی سے آدمیت چھین لی تقدیر نے

نام کیا بدلا ترا، بدلا نظامِ زندگی
غیر مُسلم ہو گئے آتش بجامِ زندگی
آگ دِکھلا دی اُنھیں، بننے لگا یوں پاک تو
اپنے آنگن میں اُنھیں سمجھا خس و خاشاک تُو
کوچہ و بازار سب ویران ہو کر رہ گئے
گھر مکینوں کے لئے شمشان ہو کر رہ گئے
عورتوں کی عصمت اور بچّوں کی جانِ پاک پر
وہ ستم ٹوٹے کہ فریادیں گئیں افلاک پر
محشر آرائی سے تیری جو ستم کش بچ گئے
بے سر و ساماں وہ نکلے ڈھونڈنے کو گھر نئے
اُن میں شامل ہے مرا نورِ نظر آزاد بھی
تجھ سے کوسوں دُور دِلی میں اماں جس کو ملی
اس کے نغمے بھی ہوئے تیری فضاؤں پر گراں
کس لئے تو ہو گیا اس درجہ ہم سے سرگراں
ہم نے یہ مانا ترے اپنے سخنور کم نہیں
اپنے جانے سے تری بزمِ سخن برہم نہیں

ہم بھی تیرے ہی نوا سنجِ چمن تھے اے وطن
عندلیبِ نغمۂ حُبِّ وطن تھے اے وطن
اتّحادِ ہندو و مسلم کے ہم خواہاں رہے
تیری بے انصافیوں پر بھی وفا پیماں رہے
تیری آزادی کے صدقے میں ہمیں ہجرت ملی
جذبۂ ذوقِ وفا کی ہم کو یہ قیمت ملی
الوداع اے ارضِ پاکستاں ہمیشہ کے لئے
یاد رکھیں گے ترے احساں ہمیشہ کے لئے
جائے سامانِ معیشت داغِ حسرت لے چلے
سبزۂ بیگانہ تھے ہم تیرے گلشن سے چلے
دیکھئے کیا رنگ ہو آگے تری تاریخ کا
خُونِ ناحق سے ہے پہلا باب تو لکھا گیا
تُو پھلے پھُولے، رہے تجھ پر کرم اللہ کا
دُور دامن سے ترے شُعلہ ہماری آہ کا
تُو ہوا دشمن ہمارا، ہم ترے دشمن نہ تھے
تُو ہوا کیوں ہم سے بدظن، تجھ سے ہم بدظن نہ تھے

اب بھی ہیں آباد تجھ میں اپنے پیارے سینکڑوں

جاننے پہچاننے والے ہمارے سینکڑوں

جو مسلماں ہیں مگر کہتے نہ تھے کافر ہمیں

اپنی محفل میں بٹھاتے تھے وہ آنکھوں پر ہمیں

آہ! ایسے مخلصوں سے بھی جُدا ہونا پڑا

وہ وفا پرور تھے، ہم کو بے وفا ہونا پڑا

داغ ہیں اُن کی جُدائی کے دلِ غمناک میں

بعدِ مُردن بھی رہیں گے جو ہماری خاک میں

ہم بُرا چاہیں ترا ممکن نہیں، ممکن نہیں!

تیرے حق میں بددُعا ممکن نہیں، ممکن نہیں!

یہ دُعا مانگا کریں گے ہم خدائے پاک سے

جوہرِ انسانیت چمکائے تیری خاک سے

ناروا داری کا کانٹا تیرے گلشن میں نہ ہو

اور تعصّب کی نجاست تیرے دامن میں نہ ہو

خیر سے تجھ کو محبت اور شر سے عار ہو

تاکہ پاکستان کہلانے کا تُو حقدار ہو!

عتابِ وطن

ہوئی خشمگیں ارضِ پاکِ وطن لگی کہنے یوں مجھ سے خاکِ وطن
کہ اے نغمہ پردازِ دورِ کہن شکستہ ہوا سازِ دورِ کہن
نہیں ہے ضرورت تری اب یہاں روانہ ہو تو سوئے ہندوستاں
نہ تھی مجھ کو ہرگز امیدِ عتاب دیا سر جھکا کر یہ میں نے جواب

"چو بدلِ تو کردم جوانیِ خویش
بہ ہنگامِ پیری مرانم ز پیش"

یہ سن کر ہوئی نرم، اور یوں کہا کہ اے شاعرِ نکتہ رس، خوشنوا
تری ذات مجھ پر نہیں کچھ گراں مگر اک قیامت ہے برپا یہاں

ہے منظور مجھ کو حفاظت تری
بچائے گی اب تجھ کو ہجرت تری!

صوفی اللہ داد خاں

اگست اور ستمبر ۱۹۴۷ء کے مہینوں میں جب مغربی پنجاب جہنم کا شعلہ زار بنا ہوا تھا کئی ایسے واقعات بھی دیکھنے اور سننے میں آئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کہیں کہیں انسانی ہمدردی اور شرافت کے پودے اس جلتے ہوئے باغ میں ابھی تک لہلہا رہے ہیں عیسیٰ خیل دریائے سندھ کے مغربی کنارے ضلع میانوالی کی تحصیل ہے۔ اور یہ پنجاب کا آخری قصبہ ہے۔ ایک ایم، ایل، اے نے اس تحصیل میں اپنی آتشیں تقریروں سے کئی ماہ تک نفرت کی آگ بھڑکائی۔ اول اول تو اس کا کچھ اثر نہ ہوا لیکن ستمبر میں فسادی عنصر امن پسند طاقتوں پر غالب آگیا اور ۲۰ ستمبر کو صبح ۱۰ بجے غنڈوں نے بازار کو آگ لگا دی اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ آدھا بازار جل گیا۔ جامع مسجد کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ صوفی اللہ داد خاں مسجد کی حالت کا جائزہ لینے آئے۔ کچھ ہندو اُن سے طالب امداد ہوئے۔ انھوں نے نہایت فراخدلی سے امداد کا وعدہ کیا اور قریباً ایک سو مرد عورتوں اور بچوں کو اسی وقت اپنے مکان پر لے گئے اور ان کے کھانے پینے کا سامان مہیا کر دیا جب تک ہند سرکار کی طرف سے عیسیٰ خیل کے ہندوؤں کو نکالنے کا بندوبست نہ ہوا صوفی صاحب ہر طرح سے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ چند اور فراخ دل و روشن خیال مسلمان بھی اس کار خیر میں اُن کے مددگار ہے۔ جن میں مسٹر غلام محمد ہاشمی اور خان خالق داد خاں ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کے نام قابل ذکر ہیں عیسیٰ خیل سے آنے والوں میں جالندھر اور دہلی میں مجھ سے جو بھی ملا اُس کی زبان پر صوفی اللہ داد خاں کا نام تھا۔ میرا دل بھی ہم وطنی کے تعلق سے صوفی صاحب کے متعلق شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ ان چند اشعار میں اسی شکر گزاری کا ناکافی اظہار ہے۔

بے بسوں کی جو تو نے کی امداد — عمر بھر گیت تیرے گائیں گے
یاد تیری بسائیں گے دل میں — خانہ ویراں جہاں بھی جائیں گے

بے گناہوں کے خُون کی پیاسی — گولیاں، خنجر، آگ، تلواریں
بے مددگار و یار، اقلیت — اکثریت کی اُس پہ یلغاریں

نظر آتی تھیں صاف اُنھیں اپنی — گلی کُوچوں میں بے کفن لاشیں
سچ اگر پوچھیے تو جیتے جی — بن رہے تھے وہ خستہ تن لاشیں

گھر رہے حشر تک ترا آباد — جس میں اُن کو پناہ دی تُو نے
جُرأتِ بے پناہ سے بخشی — مرنے والوں کو زندگی تُو نے

اِس سے بڑھ کر ثواب کیا ہوگا — خوش رکھے ربِّ دو جہاں تجھ کو
اجر دے گا وہی کریم اس کا — صوفی اللہ داد خاں تجھ کو

پاکستان

پروفیسر تلوک چند محروم راولپنڈی سے نقل مکانی کر کے دہلی پہنچ چکے ہیں اور "تیج" ویکلی کے ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ دہلی پہونچ کر آپ نے پاکستان پر ایک استفہامیہ نظم کہی ہے۔ جسے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ پاکستانی عوام اور رہنماؤں کو سوچنا چاہیئے کہ اس نظم کا جواب کیا ہے؟ (ادارہ)

ساکنانِ دیارِ پاکستاں — مجھ کو بتلاؤ از رہ ایماں
کیا وہاں کوئی بھی گناہ نہیں؟ — ہرگز اس میں بدی کو راہ نہیں؟
جھوٹ ہے اس میں اور نہ چوری ہے؟ — جبر ہے اور نہ سینہ زوری ہے؟
نہ ہوس ہے، نہ زر پرستی ہے؟ — میکدے میں وہاں نہ مستی ہے؟
اُٹھ گیا واں سے حُسنِ بازاری؟ — بند ہے اس کی یا خریداری؟
ننگ و ناموس ہے وہاں محفوظ؟ — ہر خطر سے ہے مال و جاں محفوظ؟
قتل و غارت کا اب نشاں ہی نہیں؟ — وہ زمیں اور وہ آسماں ہی نہیں؟
کوئی دھوکا وہاں نہیں ہوتا؟ — کچھ کسی کا زیاں نہیں ہوتا؟

ہے نہ غیبت وہاں نہ بدگوئی؛ فتنہ ہوتا نہیں بپا کوئی؛
بدزبانی ہے اور نہ بدکاری؛ مکر و حیلہ ہے اور نہ عیاری؛
بدسگالی ہے اور نہ بدبینی؛ نہ عمل میں کوئی بدآئینی؛
دل ہیں بغض و حسد سے سب خالی؛ مرتبہ ہے ضمیر کا عالی؛
پاک کینوں سے ہو گئے سینے؛ جتنے پتھر تھے سب ہیں آئینے؛
لینا دینا ہے بند رشوت کا؛ مٹ گیا نام کبر و نخوت کا؛
نہیں ابلیس کا گزر اس میں؛ خود ہے اللہ دادگر اس میں؛
یوں اگر ہے تو ہے وہ پاکستان بلکہ اس سے بھی برتر اس کی شان

ورنہ سارا جہاں کہے گا ضرور!
ایک زنگی کا نام تھا کافور!

"احسان" لاہور
۲۱ جنوری ۱۹۴۸ء

بھارت ماتا! تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

تیری شوکت، تیرا مان — اپنا دھرم، اپنا ایمان
تیری عزت پر قربان — اپنا تن من، اپنی جان

بھارت ماتا! تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

امن و اماں پیغام ترا — اُمرت سے پُر جام ترا
سر جائے، ہو کام ترا — روشن کرلیں نام ترا

بھارت ماتا، تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

دریا اور کہسار ترے　　جنگل اور گلزار ترے
بادل گوہر بار ترے　　راحت کے انبار ترے

بھارت ماتا تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

کٹ تو گئی زنجیر تری　　اور بڑھے توقیر تری
چمکی ہے تقدیر تری　　پھیلے گی تنویر تری

بھارت ماتا تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

نوروزِ ہند

گل بداماں ہے چمن زارِ نظامِ نو کا
کشورِ ہند کا نو روز ہے یہ روزِ سعید
آنکھیں پُر نور ہیں، دل اہلِ وطن کے مسرور
کہ ہوئی صُبحِ وطن مطلعِ انوارِ اُمید
جس نے نعمت ہمیں بخشی ہے یہ آزادی کی
اُس کے الطافِ کریمانہ سے کب ہے یہ بعید
کہ رہِ راست پہ لے آئے وہ گمراہوں کو
ہیں جو بالطبع ابھی پیرِ کلیسا کے مُرید

فرقہ داری پہ ہیں دل آج بھی جن کے مائل
یا جو کرتے ہیں تشدّد کے عمل کی تائید
میکشوں کو وہ بھی جام رکھے گا کب تک
جس نے دی ہے درِ میخانۂ عشرت کی کلید
نئی تقدیر کا سانچہ ہو ترا ہر ذرّہ
ہو مبارک تجھے اے خاکِ وطن دَورِ جدید
آرزو اُن کی بر آئی پسِ مُردن افسوس
آبرو پر جو تری ہو گئے مردانہ شہید
دلِ پُر شوق ہوا فال کا جویا تو وہیں
گوشِ مشتاق میں آئی یہ فرح بخش نوید
"للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ اسرار پدید"

آزادی

فضا کی آبرو ہے پرچمِ گردوں وقار اپنا
کہ ہے اس دور کی آزاد قوموں میں شمار اپنا

غلامی اور ناکامی کا دورِ ابتلا گزرا
مساعد بخت ہے اب اور حامی روزگار اپنا

چھٹے دامن سے اپنے داغہائے ننگِ محکومی
وطن اپنا ہے، اپنی سلطنت ہے، اقتدار اپنا

نہ گلچیں غیر ہے کوئی، نہ ہے صیاد کا کھٹکا
چمن اپنا ہے، اپنے باغباں، لطفِ بہار اپنا

اب، اے اہلِ وطن! اس کو بگاڑیں یا بنائیں ہم
مقدر پر ہے اپنے ہم کو حاصل اختیار اپنا

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا

تھا فرنگی کا احتشام بڑا   وہ شکاری تھا با نظام بڑا
ہند تھا صید زیر دام بڑا   اب ہے آزاد وہ غلام بڑا

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

توڑ کر دام شوکت انگریز   ختم کر دی حکومت انگریز
ہوئی کافور دہشت انگریز   عید تھی اپنی رخصت انگریز

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

ملک دو سو برس سے تھا محکوم — دست و پابستہ، عاجز و مظلوم
کانگرس نے بدل دیا مقسوم — کیوں نہ آفاق میں ہو اس کی دھوم

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

تھا مسلح حریف کینہ شعار — اور اہنسا کی یہ علم بردار
جنگ کرتی رہی ہے بے ہتھیار — حق نے دی اس کو فتح آخرکار

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

راہرو بھی رہی ہے، رہبر بھی — مثلِ انجم تھی نور گستر بھی
خستہ جاں، دردمند و مضطر بھی — چارہ ساز و غریب پرور بھی

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

اہنسا کے سپاہی

کشورِ ہند کو آزاد کرانے والے
پلٹنوں کے تھے سپاہی، نہ رسالوں کے سوار
تھے وہ پابند اہنسا کے، نہتے انساں
دوست ہر ایک کے اور دشمنِ رسمِ آزار
گامزن اس پہ رہے صبر و تحمّل کے ساتھ
اُن کو گاندھی نے دکھائی تھی جو راہِ دشوار
شیوۂ امن وامان، مسلکِ تسلیم و رضا
کاربند اس پہ رہے اور نہ جھجکے زنہار
چین لینے نہ دیا اُن کو زمانے نے کبھی
قہرِ انگریز کا ہوتے رہے اکثر وہ شکار

پا بہ زنجیر کبھی تا درِ زنداں پہنچے
اور کبھی گھر میں نظر بند بحکمِ سرکار
گولیوں کی کبھی سر پر ہوئی اُن کے بارش
گالیوں میں کبھی نکلا دلِ حاکم کا غبار
رُفقا اُن کے وہ جانباز، شہیدانِ وطن
جو ہوئے دار و رسن سے دمِ تعزیر دوچار
پھر غضب یہ کہ شریکِ ستم و جور رہے
اپنے ہی اہلِ وطن، یعنی وطن کے غدّار
متزلزل نہ ہوئے اُن کے قدم صورتِ کوہ
حملے گو بادِ حوادث نے کیے سلسلہ وار
شمع تھی حُبِّ وطن کی جو وطن میں روشن
اُس پہ ہوتے ہی رہے صورتِ پروانہ نثار
آخرِ کار ہوئی فتح و ظفر اُن کو نصیب
مان لی شوکتِ شاہانۂ انگریز نے ہار
اُن کی جاں کاہ ریاضت ہی کا ثمرہ ہے یہ
کہ پھر اس اُجڑے ہوئے باغ میں آئی ہے بہار!

مئی ۱۹۴۷ء

ہمارے سپاہی

کم نوش، سرفروش، سلحپوش، سخت کوش
ان سا جہاں میں اور سپاہی نہیں کوئی
آکر بہ عزمِ جنگ صف آرا ہو سامنے
دشمن کی اس سے بڑھ کے تباہی نہیں کوئی

جس معرکے میں جائیں گے لے کر خدا کا نام
دشمن کو خاک و خوں میں ملا کر ہی آئیں گے
کوہ گراں بھی راہ میں آجائے گا اگر
گرد اُس کی ٹھوکروں سے اُڑا کر دکھائیں گے

ہر چند کُشت و خوں سے انھیں احتراز ہے
بُزدل نہ جانئے گا جوانانِ ہند کو
ہیں مادرِ وطن کے یہ فرزند جاں نثار
جاں سے عزیز جانتے ہیں شانِ ہند کو

صبر ہمارا جیت گیا

اُس وقت کو یاد نہ کر ہمدم، جب دُور ہماری منزل تھی
تاریک تھیں جب راہیں ساری، بے نُور ہماری منزل تھی
جب قافلۂ ابنائے وطن سو بار گھرا طوفانوں میں
پُر عزمِ صمیم سے اپنے وہ ہر گز نہ پھرا طوفانوں میں
دامانِ ابد سے وابستہ پُرپیچ غلامی کی وادی
تھے دُور تصوّر کی حد سے انوارِ فضائے آزادی
سالار ہوئے قرباں کتنے اس محکُومی کی گھاٹی میں
کتنے ہی لعل ملے اپنے اس مظلُومی کی ماٹی میں
گزرے ہر اوگھٹ گھاٹی سے ہر سنگِ گراں کو چُور کیا
جب راہ میں خون کے دریا بھی آئے تو اُن کو عبُور کیا

کیا اونچی کالی سر بہ فلک دیواریں تھیں زندانوں کی
سائے میں جن کے نکلتی تھی جاں گھُٹ گھُٹ کر ارمانوں کی
اُف سنّاٹے میں راتوں کے وہ جھنکاریں زنجیروں کی
وہ اَوجِ فلک پر جا جا کر جو یا آہیں تاثیروں کی

پُر ہَول غلامی کی وادی اور پیٹھ پہ کوڑے آقا کے
گلزار تھی راہ شوق اپنی چھینٹوں سے خونِ تمنّا کے

گو دار و رسن کے ہنگاموں کا گرم بہت بازار رہا
اور آقائی کے زور میں آقا مائلِ صد آزار رہا
پُر ذوقِ ستم نے اس کے آخر خود اُس کو بدنام کیا
بے کار گئی تدبیر اس کی تقدیر نے اپنا کام کیا

اس وقت کو ہمدم یاد نہ کر، وہ دورِ غلامی بیت گیا
جب جور و ستم سب ہار گئے اور صبر ہمارا جیت گیا
لیکن اِس بات کو بھول نہ جا اے ساکنِ منزلِ آزادی
غفلت سے تری نذرِ طوفاں ہو جائے نہ ساحلِ آزادی

جشنِ آزادی

صبا پھر لے کے آئی ہے پیامِ جشنِ آزادی
ہے گلزارِ وطن میں اہتمامِ جشنِ آزادی

یہ جلسے، یہ چراغاں، یہ سرور و نور کا عالم
ہے صبحِ جنت الفردوس، شامِ جشنِ آزادی

ہوئی سامانِ تسکیں معبدوں میں وہ دُعا بن کر
جو رونق میکدوں میں ہے بنامِ جشنِ آزادی

نظامِ جشنِ آزادی سے اے رُوٹھے ہوؤ، دیکھو
ہے دستِ خاص نہرو میں نظامِ جشنِ آزادی

اِسی دن کے لئے قرباں کئے بیٹھے تھے جو سب کچھ
دلِ احرار سے پوچھو مقامِ جشنِ آزادی

کہاں خوشنودیٔ اغیار کے مجبور ہنگامے
کہاں جمہوریت کا اِحتشامِ جشنِ آزادی

وطن کے تشنہ کاموں کو صلائے عام ہے ساقی
کہ پھر گردش میں ہے کاس الکرامِ جشنِ آزادی

شاعر اور آزادی

شاعر

کر کے طے ہر ہفتخوانِ امتحاں تیرے لئے
مضطرب تھے کب سے اے جانِ جہاں تیرے لئے
اے وقارِ زندگی، اے نو بہارِ زندگی!
ہم نے دیکھے ہیں بہت جورِ خزاں تیرے لئے
سر بکف تھے، جاں بلب تھے، پیکرِ ایثار تھے
ساکنانِ کشورِ ہندوستاں تیرے لئے

وقفِ زنداں بھی ہوئے، دار و رسن کی نذر بھی
ہو گئے برباد کتنے خانداں تیرے لئے
نو عروسانِ وطن کے لُٹ گئے کتنے سُہاگ
مر گئے بے وقت کتنے نوجواں تیرے لئے
دل بھی چھلنی ہیں، جگر بھی، آج تک ماں باپ کے
بے زباں بچّوں نے کھائیں گولیاں تیرے لئے
شاعرانِ خوشنوا کے نغمہ ہائے دل نواز
لب تک آتے تھے بہ اندازِ فغاں تیرے لئے
آ گئی آخر یہاں تو، گرچہ بعدِ انتظار
دل ترے مقدم پہ قرباں نذرِ جاں تیرے لئے
تجھ پہ، لیکن اے شبِ تارِ جوانی کی سحر
کس لئے ہے آج تک غالب دھندلکوں کا اثر

آزادی

ٹھوکریں کھاتی بحالِ زار و مضطر آئی ہوں
کیا کہوں کن مشکلوں سے میں گزر کر آئی ہوں

زخم جو کھائے تھے تم نے، وہ مرے تن پر لگے
خارزاروں سے یہاں مثلِ گُلِ تر آئی ہُوں

سَو برس پہلے کیا تھا عزم جو تم نے اسے
راہبر اپنا بہ رنگِ نوبہار کر آئی ہُوں

تُم نے استقبال میرا قتل و غارت سے کیا
گرچہ میں بے منّتِ شمشیر و خنجر آئی ہُوں

مانتے ہو کس قدر دشوار تھا آنا مرا
جانتے ہو تم کہ کس حیلے سے کیوں کر آئی ہوں

برکتیں اپنی نہیں لائی ہوں اپنے ساتھ میں
اس لئے گویا نہ آنے کے برابر آئی ہوں

کیا یہی کم ہے کہ میں نے پا لیا ہے پھر تمھیں
کیا یہ مُبہم ہے کہ میں تم کو میسّر آئی ہُوں

دولتِ جاوید ہوں میں، مجھ کو اپناؤ اگر
کب یہ کہتی ہوں کہ لے کر لعل و گوہر آئی ہُوں

مالک و مختار اب اپنے مقدّر کے ہو تم
شکوہ کس کا ہے تمھیں، کس کا گِلہ کرتے ہو تم؟

زلزلے اور طوفان

زلزلوں سے اور طوفانوں سے ہیبت ناک تر
تھا غلامی کا سفر، ہم جس کو کر آئے ہیں طے
قطرۂ اشکِ فلک ہے، جس کو طوفاں کہہ دیا
ہے زمیں کے دل کی دھڑکن، زلزلہ کیا چیز ہے
ہاں، مگر کیوں آسماں روتا ہے یوں زار و قطار
کس لئے چھاتی دھڑکتی ہے زمیں کی پے بہ پے
شاعرانہ ہے جواب اس کا، مگر شایانِ غور!
لب نہیں کھلتے ہیں شاعر کے کبھی بے علم شے
آسماں روئے گا ہم پر اور لرزے گی زمیں
دل میں جب تک کھوٹ ہے اور لب پہ ہے بھارت کی جے
خود غرض کے نعرۂ "جے ہند" میں ہو کیا اثر
کرشن کی بنسی نہیں ہوتی ہر اک بوسیدہ نے!

مقامِ شکر

تنگیٔ کاشانہ کیوں ہے باعثِ افسردگی
یہ زمیں تیرے لئے، یہ آسماں تیرے لئے
رودِ جمنا کے کناروں کی فضائے دلنشیں
محوِ رقصِ ناز ہر موجِ رواں تیرے لئے
تیری خاطر ہے بپا ہر کُنج میں بزمِ نشاط
وقفِ زیر و بم طیورِ نغمہ خواں تیرے لئے
دُھوپ غربت کی اگر ہے باعثِ آزردگی
ہر شجر تانے ہوئے ہے سائباں تیرے لئے
ہے اگر تیرے مقدّر میں بلندی عزم کی
جادۂ روشن ہے نقشِ کہکشاں تیرے لئے
اور اگر تُو ہے رہینِ پستیٔ ہمّت، تو ہے
فرشِ راحت سبزۂ دامن کشاں تیرے لئے
اَے دلِ ناداں! مقامِ شُکر ہے شکوؤں کو چھوڑ
مِل نہیں سکتا جو دہلی میں مکاں تیرے لئے!

دوستوں کی موت پر شادمانی

مارچ سینتالیس سے پہلے جو اپنے مہرباں
ہو گئے رخصت جہاں سے جانبِ دارالاماں
بسکہ تھی اُن کی جدائی باعثِ دردِ نہاں!
فرطِ غم سے اُن کے مرنے پر ہوئے ہم نوحہ خواں
لیکن اب اُن دوستوں کی موت پر شاداں ہیں ہم
اور اپنے زندہ رہ جانے پہ اشک افشاں ہیں ہم
اپنی آنکھوں نے جو دیکھے فتنہ ہائے انقلاب
اپنے کانوں نے سنا جو ماجرائے انقلاب
آہ! جو نازل ہوئی ہم پر بلائے انقلاب
جس طرح ہم پر ہوئی مشقِ جفائے انقلاب
مرنے والے جان دے کر اس سے مصئوں ہو گئے
زندگی سے کیا ملا؟ زندوں کے دل خوں ہو گئے!

بچ گئی کشتی

پھونک کر زہری فسوں، پھیلا گیا خونی جنوں
جاتے جاتے ساحرِ برطانیہ کیا کر گیا
آخری ٹھوکر سے ٹکڑے کر دئے اس مُلک کے
یا اُسی برتن کے، جس برتن میں خود کھا کر گیا
پھوٹ کی "کل" سے حکومت کی دیارِ ہند پر
جب چلا تو اور بھی کچھ اُس کو چلتا کر گیا
تھی محبّانِ وطن سے لاگ، اُن کے واسطے
گُتھّیاں اُلجھا کے دردِ سر مہیّا کر گیا
چار جانب آتشِ کین و حسد بھڑکا گیا
محشرِ جور و ستم ہر سمت برپا کر گیا
ہند کی کشتی کو چھوڑا ورطۂ آفات میں
ناخدائے بے مروّت خود کنارا کر گیا
جُز امیدِ رحمتِ باری دھرا تھا کیا یہاں
بچ گئی کشتی کہ ہر دستا کھویا تھا یہاں!

اہنسا کا پیغمبر

مہاتما گاندھی

تجھے پیدا کیا دورِ زوالِ آدمیّت میں
کہ تجھ کو دیکھ کر انسان پہچانے مقام اپنا
عمل کی زندگی کو جب نہ دیکھا اہلِ غفلت نے
دیا اُن کو متاعِ زندگی دے کر پیام اپنا

ترا پیغام پیغامِ ازل تھا، یعنی انساں کو
کدُورت اور نفرت ناروا ہے نوعِ انساں سے
یہی پیغام عیسیٰ اور گَوتم لے کے آئے تھے
لیا اِقرار نانک نے اسی کا اہلِ ایماں سے

اہنسا مسلکِ اہلِ صفا ہے روزِ اوّل سے
رہا ہے مشرق و مغرب کو دائم اتّفاق اس پر
دِکھائی راہ سیدھی کج روانِ دھر کو تو نے
ہوئے مائل نہ لیکن عاشقانِ افتراق اس پر

بھٹکتا پھر رہا ہے دشتِ آتشناک میں انساں
لپک کر ہر طرف شعلوں سے شعلے آن ملتے ہیں
جہاں تُو لے کے جانا چاہتا تھا آدمیّت کو
وہاں صِدق و صفا، مہر و وفا کے پُھول کھلتے ہیں

ترے خُونیں فسانے کو ہُوا رنگِ بقا حاصل
رہے گا رہتی دنیا تک ترے ایثار کا چرچا
صفا کیشانِ عالم کے لیے تسکیں فزا ہو گا
تری جانِ وفا پرور، دلِ غمخوار کا چرچا

مہاتما گاندھی

ہادیٔ امن و اماں تھا، پیکرِ ایثار تھا

ہند کی پیشینہ عظمت کا عَلَم بردار تھا

گو فقیرِ بے نوا تھا عالمِ اسباب میں

سینہ تانے رُوبروئے سَطوتِ اغیار تھا

جُھک گئی انگریز کی شوکت بھی اس کے سامنے

تھا اگر حربہ کوئی، پیکارِ بے آزار تھا

بہتریں انسان دُنیا کا نہ یوں مانا گیا

فخرِ شانِ آدمیّت، سرورِ اَبرار تھا

عاملِ گیتا کروڑوں میں نہیں اس سا کوئی

ترکِ دنیا پر بھی وہ دنیا کا خدمتگار تھا

حق پسند و حق شعار و حق شناس و حق گزار

عُمر کے ہر مرحلے پر اُس کو حق سے پیار تھا

رہنمائی قوم کی درماندگی میں اُس نے کی

خود شناسی سے شناسائے رہِ دشوار تھا

منزلِ مقصودِ آزادی پہ لے آیا اسے

ملتِ مجبور کا وہ کارواں سالار تھا

کیوں نہ جاگ اُٹھتی تری تقدیر اے ہندوستاں

جبکہ تیرا راہبر اک مردِ شب بیدار تھا

رہبروں کو روشنی ملتی تھی اُس کی ذات سے

ہند میں گاندھی منارِ جلوۂ انوار تھا

وہ اہنسا کا پیمبر، شانتی کا دیوتا

یا مسیح اس دَور کا، گوتم کا یا اوتار تھا

مار کر اس کو کسی کے ہاتھ آخر کیا لگا

قوم کے ماتھے پہ کالا داغ ہتیا کا لگا

تیرا لہو ٹپک کر جس خاک پر گرا ہے

لعل و گہر سے اُس کا ہر ذرّہ اب سوا ہے

انعامِ امن

راج گھاٹ سے واپس آتے ہوئے

آسماں پر تُو ہے اے امن واماں کے دیوتا
پُج رہے ہیں عالمِ فانی میں تیرے نقشِ پا
زندگی ازبسکہ تھی تیری ضیا گیرِ وفا
بعدِ مردن خاک سے پیدا ہے تنویرِ وفا
فاتحہ آ آ کے قُدسی پڑھتے ہیں اس خاک پر
روز گلہائے عقیدت چڑھتے ہیں اس خاک پر
مشرق و مغرب کی قوموں کے نمائندے تمام
پیش کرتے ہیں تجھے اپنا خراجِ احترام
سر جھکائے، ہاتھ جوڑے، آنکھ میں آنسو لئے
امنِ عالم کا دلوں میں جذبۂ دلجُو لئے
دل کو یاں عجز آشنا کرتے ہیں دنیا کے امیر
شاہزادے ہوں کہ شاہوں کے جہاندیدہ سفیر
بٹ رہا ہے ساحلِ جمنا سے آج انعامِ امن
پھیلتا جاتا ہے دنیا میں ترا پیغامِ امن!

ہمارے حق میں جس کی صُبحِ نَو روزِ سعادت تھی
زہے قسمت! کہ پھر بھارت میں وہ روزِ سعید آیا

ہماری عید ہے، یا جنم دن ہے آج گاندھی کا
وہ گاندھی بابِ آزادی کی جو بن کر کلید آیا

مسیحا بن کے جس نے رُوح پھُونکی مُردہ ملّت میں
جو خود بن کر مجسّم زندگانی کی نوید آیا

اہنسا سے کیا مغلوب استبداد کو جس نے
جو بن کر شافیِٔ آزارِ تہذیبِ جدید آیا

شبِ تارِ غلامی یاس خیز و دہشت افزا تھی
وہ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے شمعِ اُمید آیا!

تصوّر میں مرے محروم اک تصویر ہے گویا
دوبارہ لوٹ کر اپنے وطن میں وہ شہید آیا

خیر مقدم

اکتوبر ۴۸ء میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کی خدمت میں اہلِ دہلی نے ایڈریس پیش کیا۔ یہ نظم اس تقریب میں پڑھی گئی۔

مرحبا، صد مرحبا، اے کارواں سالارِ قوم
اے عزیزِ قوم، فخرِ قوم، اے سردارِ قوم

نام تیرا باعثِ تجدیدِ اقبالِ وطن
ذات تیری دافعِ ہر صورتِ ادبارِ قوم

سربلندی عزم سے تیرے ملی ہے قوم کو
واقعی سردار ہے تو اے علم بردارِ قوم

چارہ فرمائی سے تیری ناپدید آخر ہوا
وہ غلامی کا مرض، صدیوں کا وہ آزارِ قوم

تیری تدبیروں نے کاٹی ظلمتِ شب ہائے تار

تیری تنویروں سے اُبھرا مطلعِ انوارِ قوم

تو وطن کی شان و شوکت، تو وطن کی آبُرو

ہے ریاضت سے تری گنگ و جمن کی آبُرو

اَے کہ تیری ہر گرج میں ہیبتِ ضرغام ہے

نام تیرا سن کے دشمن لرزہ براندام ہے

تیرے عزمِ آہنیں کے سامنے اے ذی ہمم!

گھاس کے تنکے سے کم تر تیغِ خوں آشام ہے

حق شعاروں کے لئے تو زندگانی کی نوید

ہرزہ کاروں کے لئے تو موت کا پیغام ہے

ٹوٹا پھوٹا وہ پڑا ہے حلقۂ دامِ فرنگ

کارداں دنیا کے کہتے ہیں یہ تیرا کام ہے

حامیٔ امن و اماں ہے، پیروِ گاندھی ہے تو

تیرے حق میں حق پسندوں کی دعائے عام ہے

سر پہ اپنی قوم کے سایہ ترا برسوں رہے

کاروانِ ہند کا تو رہنما برسوں رہے!

ریاست یا مُلک؟

حیدرآباد میں پولس ایکشن کے بعد غیر ممالک میں حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے
میر لائق علی اس کو ریاست کے بجائے ملک کہتے رہے۔ اس پر یہ قطعہ موزوں ہوا

حیدرآباد اک ریاست ہے — اس حقیقت کو جانتا ہے مُلک
جا کے پیرس میں اس ریاست کو — فرقہ داروں نے کہہ دیا ہے مُلک
ہے یہ جغرافیہ نیا کوئی — ملک کے بیچ آ گھسا ہے مُلک
تھی سخن گسترانہ بات اگر — سخت بھدا مبالغہ ہے مُلک
زندہ ہوتے امیر و داغ اگر — جن کی جاگیر شعر کا ہے مُلک
وہ بھی کہتے کہ اس قصیدے میں — ناروا بلکہ ناسزا ہے "مُلک"

کیوں نہ عرشِ بریں کہا اس کو
مجھ کو حیرت ہے کیوں کہا ہے "مُلک"

جنوری ۱۹۴۹ء میں نئی دہلی میں ایشیائی کانفرنس کے انعقاد کی تقریب میں یہ شعر موزوں ہوئے

ہوگا بلند پھر عَلَمِ شانِ ایشیا
آئے ہیں ٹھان کر یہ محبانِ ایشیا

بازیچۂ فرنگ رہا ہے جو مُدّتوں!
اب صاف ہو رہا ہے وہ میدانِ ایشیا

وہ دن نہیں ہے دُور کہ ہو جائے پاک و صاف
محکومیوں کے داغ سے دامانِ ایشیا

صدیوں کے بعد سوزِ دلِ اہلِ ہند سے
روشن ہوئی ہے شمعِ شبستانِ ایشیا

پھیلے گی اس سے روشنی عالم میں امن کی
ہوگا ظہورِ مہرِ درخشانِ ایشیا

اب ایشیائیوں کا یہی عزم ہے کہ ہو
ماضی کی بات قصۂ حرمانِ ایشیا

گوتم، مسیحؑ، اور محمدؐ کے باوجود!
دنیا میں کیوں ذلیل ہو انسانِ ایشیا

سفیرانِ ایشیا

گُل چینیٔ فرنگ سے بے آبرو رہی
ہر فصل میں بہارِ گلستانِ ایشیا

مُدّت کے بعد کھُل ہی گئی باغباں کی آنکھ
چمکی کچھ ایسی صبحِ درخشانِ ایشیا

آہوں نے کی بلند صدا احتجاج کی
دیکھا گیا نہ حالِ پریشانِ ایشیا

دہلی میں سربلند ہوا چاہتا ہے پھر
صدیوں کا سرنگوں عَلَمِ شانِ ایشیا

برکت نئی تمھارے عزائم کو دے خدا!
صد مرحبا! گروہِ سفیرانِ ایشیا

خیر مقدم

اخبار نویسانِ پاکستان کے وفدِ خیر سگالی کی آمد پر

اے صحافت کی زمیں کے آسمانو، مرحبا
منزلِ امن و اماں کے اے نشانو، مرحبا

گلشنِ تہذیب کے اے باغبانو، مرحبا
عالمِ جمہور کے اے ترجمانو، مرحبا

اے معزز میہمانو، مرحبا، صد مرحبا!
نکتہ سنجو، نکتہ دانو، مرحبا، صد مرحبا!

آشتی، آرام کا لے کر پیامِ جاں فزا
آئے ہو ہندوستاں میں ازرہِ صدق و صفا

ذرّہ ذرّہ ہے یہاں کا طالبِ مہر و وفا
گامزن ہیں راہِ گاندھی پر ہمارے رہنما

معتقد یعنی اہنسا کے جوان و پیر ہیں
آیۂ "لَاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ" کی تفسیر ہیں

آپ کی سعیٔ مبارک بارور ہو گی ضرور
شاخِ نخلِ خیر خواہی پُرثمر ہو گی ضرور

دونوں ملکوں کو تمیزِ خیر و شر ہوگی ضرور
امن کی منزل پہ دونوں کی نظر ہوگی ضرور

اب کریں پرہیز دونوں کشت و خوں کی یاد سے
کیا ملے گا ہم کو اُس دورِ جنوں کی یاد سے

اس حقیقت کا مگر ہے ناگزیر اظہار بھی
تھے جنوں انگیزیوں میں پیش پیش اخبار بھی

شامل اِس گھمسان میں شاعر بھی تھے، نثّار بھی،
نثر بھی تیغِ رواں تھی، نظم کے اشعار بھی

اب یہ لازم ہے کہ سب کو راستی منظور ہو
خارزارِ فتنہ و شر سے صحافت دور ہو

فتنہ و شر نے کیا ہے ہم کو دُنیا میں ذلیل
اندمالِ زخمِ ذلّت کی کوئی سوچیں سبیل

یوں نہ ہوتا، گر نہ ہوتی غیر کی نیّت دخیل
خیر اب تو آپ ہم ہیں اپنی عزّت کے کفیل

کیوں نہ لیں اپنی روایاتِ رواداری سے کام
جس سے ہو دُنیا میں روشن ہند و پاکستان کا نام

ہماری بُرائیاں

انگریز سے منسوب کیا کرتے تھے اُس کو
آتی تھی نظر ہم کو وطن میں جو بُرائی
کہتے تھے کہ لاچار ہے، مجبور ہے محکوم
محکوم کے نقصان میں ہے حاکم کی بھلائی

دو سال ہوئے دورِ غلامی کو سدھارے
اب حاکم و محکوم کا جھگڑا نہیں باقی
کوئی یہ بتائے کہ ہے وہ کون بُرائی
ویسا ہی وجود آج بھی جس کا نہیں باقی

سنہ ۱۹۴۹ء

آگ لگانے والے

چین پائیں گے کہاں آگ لگانے والے
خود ہی جل جائیں گے اوروں کو جلانے والے
بھُولیں طاقت پہ نہ شوکت کی زبانے والے
اور بھی زیرِ فلک دَور ہیں آنے والے

سِتم و جَور کی قائم نہ رہیں گی گھاتیں
دن کبھی کے ہیں بُرے اور کبھی کی راتیں
ہے اگر کوئی خدا، اور خدا ہے بھی ضرُور
اُس کے انصاف کا ٹوٹے گا نہ ہرگز دستُور

جن کے اعمال سے ہے امن کی دنیا میں فتُور
ایک دن اپنی رعونت سے وہ ہوں گے مقہُور
کسی قانون پہ چلتا ہے نظامِ عالَم
زیرِ انصاف بدلتا ہے نظامِ عالَم

پیامِ صُلح

لائی پیغام موجِ بادِ بہار — کہ ہوئی ختم شورشِ کشمیر

دل ہوئے شاد امن کیشوں کے — ہے یہ گاندھی کے خواب کی تعبیر

صُلح جوئی ہیں، امن کوشی ہیں — کاش ہوتی نہ اس قدر تاخیر

تاکہ ہوتا نہ اس قدر نقصاں — اور ہوتی نہ دہر میں تشہیر

بچ گئے ہوتے نوجواں کتنے — جن کو مروا دیا بہ صرفِ کثیر

ذکر کیا اس کا، جو ہوا سو ہوا — ان بچاروں کی تھی یہی تقدیر

کام لیں اب ذرا تحمّل سے — دونوں ملکوں کے حسب عناً تدبیر

دِل سے تخریب کا خیال ہو دُور — اور ہو جائیں مائلِ تعمیر

رنگ اس میں خلوص کا بھر دیں | کھچ رہی ہے جو امن کی تصویر
عہد و پیماں ہوں وقفِ استقلال | اُن کی تکمیل میں نہ ہو تقصیر
اہلِ اخبار ہوں وفا آموز | قاطعِ دوستی نہ ہو تحریر
پیشوایانِ ملک و ملت کی | ہو مودّت فروز ہر تقریر
عامۃ الناس ہوں اِدھر نہ اُدھر | کسی عنوان اشتعال پذیر
علمِ آشتی بلند رہے | اندرونِ نیام ہو شمشیر
ہر دو جانب کی بیٹیاں بہنیں | ہیں جو مجبورِ قیدِ بے زنجیر
جس قدر جلد ہو رہا ہو جائیں | اُن کا کیا جرم ہے کیوں رہیں وہ اسیر
ہے تقاضا یہی شرافت کا | دونوں ملکوں کی اس میں ہے توقیر
رہیں آباد ہند و پاکستاں | تیری رحمت سے اے خدائے قدیر

عرض پرداز ہو چکا محروم
اب کہیں کچھ حفیظ اور تاثیر

آزاد ہندوستان

دہلی میں پہلے جشن جمہوریت کی تقریب پر

بلندی پہ ہے آج اپنا ستارا، وہ پستی، جو تھی ننگ ہستی، کہاں ہے
کہ لطفِ خدائے جہاں آفریں سے، زمینِ وطن رشکِ آسماں ہے

گیا وہ زمانہ کہ محکوم تھے ہم، ستمدیدہ، بدحال، مظلوم تھے ہم
اب آزاد ہیں اور دلشاد ہیں ہم، کہ آزاد و آباد ہندوستان ہے

یہ مشرق اہنسا کے خورشید کا ہے، یہ مرکز زمانے کی امید کا ہے
پیامی ہے انصاف و امن و اماں کا، دلِ ایشیا اور فخرِ جہاں ہے

ہمالہ کا سر فخر سے اور بھی آج اونچا ہوا ہے بصد شان و شوکت
نیا اوج گنگا کی ہر موج میں ہے، نئی خوش خرامی سے جمنا رواں ہے

نہ جورِ زمن کی شکایت ہے باقی، نہ دورِ کہن کی حکایت ہے باقی
غلامی ہے اک بھولی بسری کہانی، نئی بزم ہے اور نئی داستاں ہے

نہ گلچیں کے ہاتھوں پریشانِ گل تر، نہ صیاد کی ہے نظر آشیاں پر
غرض عہدِ امن و اماں ہے سراسر، نوا ریز بلبل، چمن گلفشاں ہے

ہر اک فرقہ آسودہ ہے اس وطن میں، گل و سبزہ و خار جیسے چمن میں
ترنگا جو لہرا رہا ہے فلک پر، علم اپنی جمہوریت کا نشاں ہے

۲۶ جنوری

روزِ سعید آیا چھبّیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا!

یہ دورِ نو مبارک فرخندہ اختری کا
جمہوریت کا آغاز، انجام قیصری کا
کیا جانفزا ہے جلوہ خورشید خاوری کا
ہر اک شعاعِ رقصاں مصرع ہے انوری کا

جمہوریت نے پرچم لہرا کے سروری کا
توڑا طلسم باطلِ شاہوں کی خودسری کا
دکھلا دیا جہاں کو انجام قیصری کا
جمہور کو مبارک یہ دور داوری کا

اے شاعرو! دکھاؤ جوہر سخنوری کا
اے مطربو! جگاؤ جادو نواگری کا
ہے یہ اثر وطن کی فرخندہ اختری کا
ذرّوں نے اوج پایا تاروں کی ہمسری کا

بھارت کی برتری میں کس کو کلام ہے اب
تھا جو رہینِ پستی گردوں مقام ہے اب
جمہوریت پہ قائم سارا نظام ہے اب
اعلیٰ ہے یا ہے ادنیٰ با احترام ہے اب

صدیوں کے بند ٹوٹے، آزاد ہو گئے ہم
قیدِ گراں سے چھوٹے، دل شاد ہو گئے ہم
بے خوف، بے نیازِ صیّاد ہو گئے ہم
پھر بس گیا نشیمن، آباد ہو گئے ہم

مُضطر جو تھی دلوں میں وہ آرزُو بر آئی
تکمیلِ آرزُو نے دل کی خلش مٹائی
جس مُلک پر غلامی بن بن کے شام چھائی
صبحِ مسرّت اُس کو اللہ نے دکھائی

تعبیرِ خوابِ گاندھی، تفسیرِ حالِ نہرو
آزاد کی ریاضت، سردار کی تگاپُو
رخشاں ہے حُرّیت کا زیبا نگارِ دلجُو
تسکینِ قلبِ مُسلم، آرامِ جانِ ہندُو

قرباں ہوئے جو اس پر رُوحیں ہیں شاد اُن کی
ہم جس سے بہرہ ور ہیں وہ ہے مُراد اُن کی
ہے بسکہ سرفروشی شایانِ داد اُن کی
بھارت کی اِس خوشی میں شامل ہے یاد اُن کی

آزاد ہو گیا جب ہندوستاں ہمارا
ہے سُود کے برابر ہر اک زیاں ہمارا
منزل پہ آن پہنچا جب کارواں ہمارا
کیوں ہو غُبارِ منزل خاطر نشاں ہمارا

ایوانِ فرخی کی تعمیرِ نَو مُبارک
آئینِ زندگی کی تدبیرِ نَو مُبارک
ہر ذرۂ وطن کو تنویرِ نَو مبارک
بھارت کے ہر بشر کو توقیرِ نَو مُبارک

ہر صبح دورِ نو کی پُر ابتسام ہوگی
مثلِ سوادِ گیسو ہر ایک شام ہوگی
جمہوریت ہماری جسمِ احتشام ہوگی
ارض و سما کی گردش اب دورِ جام ہوگی

یہ روزِ پُر سعادت نوروزِ ہند کا ہے
سرمایۂ مسرت، جاں بخش، دل فزا ہے
جلووں میں اس کے شامل گاندھی کی ہر دعا ہے
نہرو کے ولولوں نے اس کو شرف دیا ہے

بھارت کا عزم ہے یہ، توفیق اے خدا دے
دُنیا سے این و آں کی تفریق کو مٹا دے
امن و اماں سے رہنا ہر ملک کو سکھا دے
ہر قوم شکریے میں ہر سال یہ صدا دے
روزِ سعید آیا چھبّیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا!

مولانا ابوالکلام آزاد

تحسین کے مستحق ہیں وہ احرارِ ملکِ ہند
روشن ہوئی ہے جن سے شبِ تارِ ملکِ ہند
بے اسلحہ جو شوکتِ انگریز سے لڑے
مردانہ حادثاتِ بلاخیز سے لڑے
جو بے نیاز راحت و آرام سے رہے
زندانیِ فرنگ جو برسوں بنے رہے
جن کے جہاد سے وطن آزاد ہو گیا
قلبِ حزینِ اہلِ وطن شاد ہو گیا

نامِ بلندِ حضرتِ آزاد انہی میں ہے

نازاں ہے جس پہ عالمِ ایجاد، انہی میں ہے

آزاد راہِ راست پہ گاندھی کا ہمقدم

نقشِ وقارِ ہند ہے جس کا قدم قدم

آزاد ہے وہ مردِ مجاہد کہ جس کا نام

رخشاں رہے گا ہند کی تاریخ میں مدام

سرِ منزلِ وفا پہ رواں عمر بھر رہا

جور و ستم کے سامنے سینہ سپر رہا

عِلم و ادب کا چشمۂ جاری ہے جس کی ذات

ہے دُھوم جس کے فضل کی تا دجلہ و فرات

یارب یہ چشمہ ہند میں برسوں رواں رہے

یہ سرپرستِ علم و ادب جاوداں رہے!

۱۹۵۴ء

آہ! سر تیج بہادر سپرو

سر تیج بہادر بھی گئے بزمِ وطن سے
رخصت ہوئی یا نکہتِ گُل صحنِ چمن سے
فریاد ہے اے موت، تری رسمِ کہن سے
فارغ نہ ہوا ہند کبھی رنج و محن سے
گریاں ہے ادب، حُبِّ وطن نالہ کناں ہے
لب پر جو سخن ہے وہ بہ اندازِ فغاں ہے
بے مثل تھا وہ ماہرِ آئینِ سیاست
زیبا اسے پیغمبریِ دینِ سیاست
وہ پیکرِ سنجیدۂ تمکینِ سیاست
استادِ دبستانِ قوانینِ سیاست
ذات اُس کی نمائندۂ تہذیبِ کہن تھی
جو بات تھی سرمایۂ اعزازِ وطن تھی!

آہ سروجنی نیڈو

لالہ و گُل کی کمی ہرگز نہ تھی، پھر کس لئے
فصلِ گُل میں خُوں فشاں ہے دیدۂ خونبارِ ہند

یہ سنانی ہے کے آہیں بھرتی آئی ہے صبا
اُڑ گئی اپنے چمن سے بُلبلِ گلزارِ ہند

فخر جن پر ہند کو تھا، اُٹھتے جاتے ہیں وہی
آسماں ہے آہ! کب سے درپئے آزارِ ہند

شانِ مردانِ وطن تھی ذات اے نیڈو تری
جنگِ آزادی میں تھی تو رہبرِ احرارِ ہند

نازِ نسوانِ وطن تھی نغمہ آرائی تری
تیرے دم سے شکر افشاں تھا لبِ گفتارِ ہند

گرمیِ سوزِ وطن سے پھونک ڈالے تونے دل
تیرے دل سے ہو کے نکلی آہِ آتشبارِ ہند

نام تیرا لکشمی اور پدمنی کے ساتھ ساتھ
صُبحِ محشر تک رہے گا شاملِ اذکارِ ہند

سروجنی نیڈو کی موت پر

رُخِ اہلِ ہند سے ہے عیاں اثرِ ملالِ سروجنی
کہ وطن کو حادثۂ عظیم ہے انتقالِ سروجنی

ہیں سکوتِ مرگ کے سائے میں گُل و غنچہ سب کہ چمن میں اب
کوئی عندلیبِ نواطراز نہیں مثالِ سروجنی

وہ سرورِ لطفِ سخن کہاں، وہ نوائے توبہ شکن کہاں
کہ فضائے ہند سے اُڑ گیا نشۂ مقالِ سروجنی

جو گُل اُس میں جلوہ طراز ہیں، وہ امینِ نکہت راز ہیں
ہے خزاں کی زد سے بہت پرے چمنِ کمالِ سروجنی

ہیں سخنور آج اگر حزیں تو ملول اہلِ عمل بھی ہیں
عمل و سخن پہ ہے چھا رہا غمِ ارتحالِ سروجنی

اِظہارِ شُکر

رفیع احمد قدوائی وزیر خوراک کی خدمت میں

یاس کی ظُلمت وطن پر جب کہ تھی چھائی ہوئی
گوشۂ عزلت میں تھی اُمّید گھبرائی ہوئی

گرچہ آزادی بہارِ جاں فزا ہے فی المثَل
اِس چمن کی ہر کلی لیکن تھی مرجھائی ہوئی

دشمنِ صبر و سکوں تھی فکرِ قُوتِ لایموت
یعنی ہر دل پر مُسلّط ناشکیبائی ہوئی

قحط بن کر جان لیوا تھی وہ بے درماں بلا
سر سے ٹلتی ہی نہ تھی انگریز کی لائی ہوئی

ایک مخلص دردمندِ قوم کی سعیِ بلیغ
مرنے والی قوم کے حق میں مسیحائی ہوئی

جستجوئے صادق و عزمِ مصمّم کے طفیل
چیز جو کھوئی ہوئی تھی بن گئی پائی ہوئی

مشکلیں سب ہو گئیں آساں خدا کے فضل سے
شاملِ تقدیر جب تدبیرِ قدوائی ہوئی!

یادِ قدوائی

منزل کو ہم رواں تھے بصد شوق اور رفیع
ہمّت فزائے قافلۂ رہ نوَرد تھا
ہر مرحلے کو اُس نے تدبُّر سے طے کیا
جُرأت میں بے مثال، ذہانت میں فرد تھا
جو مشکل آئی سامنے، ٹھکرا دیا اُسے
ہر سنگِ راہ ایک ہی ٹھوکر میں گرد تھا
اے آہ! کام اُس کا اُسی نے کیا تمام
اہلِ وطن کے واسطے جو دل میں درد تھا
ہندوستاں میں کون ہے اب اس کا جانشیں
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

لالہ لاجپت رائے کی یادیں

ہم سا جہاں میں دَرد کا مارا نہیں کوئی
یعنی ہمارے دَرد کا چارا نہیں کوئی
وِیران دیارِ دل ہے، دل آرا نہیں کوئی
پُرسانِ حالِ زار ہمارا نہیں کوئی
جب سے وطن چُھٹا ہے، سہارا نہیں کوئی
کیا انتقام ہم سے لیا انقلاب نے
خوں ایک ایک رگ سے پیا انقلاب نے
غرقابِ اضطراب کیا انقلاب نے
جس میں ہمیں دھکیل دیا اِنقلاب نے
اُس بحرِ بیکراں کا کنارا نہیں کوئی

دشمن زمیں ہے اور ہے بدخواہ آسماں
مجبور ہو کے پستے ہیں دونوں کے درمیاں
اب کوئی مرحلہ ہے نہ منزل کا ہے نشاں
لُٹ پٹ کے قافلہ ہے شبِ تار میں رواں
رہبر بنائیں جس کو ستارا نہیں کوئی

جانِ حزیں ہے منزلِ غمہائے بے قیاس
آئی ہوا نہ شامِ غریباں کی ہم کو راس
ہمدم ہر ایک راہ میں حرماں ہے یا ہراس
آنکھیں دکھا رہی ہے ہمیں ہر قدم پہ یاس
اُمید کا کہیں سے اشارا نہیں کوئی

وہ گُل کہاں ہیں جن سے تھی روشن چمن کی آگ
بُلبل کا دل ہے اور ہے رنج و محن کی آگ
حرص و ہوا بھڑک اُٹھے، جیسے ہو بَن کی آگ
افسردہ ہو گئی غمِ اہلِ وطن کی آگ
رخشاں کسی کے دل میں شرارا نہیں کوئی

آتی ہے باغِ دہر میں آزار کو خزاں
کب چھوڑتی ہے سبزہ و اشجار کو خزاں
یکسر گئی لتاڑ گل و خار کو خزاں
تاراج کر گئی ترے گلزار کو خزاں
اے لاجپت! یہاں چمن آرا نہیں کوئی

اِس بیکسی میں آتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
پنجاب لے کے جاتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
نقشے وہی دکھاتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
ہم کو لہو رُلاتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
موجود تو نہیں تو ہمارا نہیں کوئی

کشمیر سے خطاب

صُورتگرِ ازل نے صبحِ ازل دکھایا
اپنا کمالِ صنعت، کر کے تجھے نمایاں
تجھ سا نظر نہ آیا دنیا میں اور کوئی
گُل پُوش، گُل بداماں، سرتا قدم گلستاں
اے انتخابِ عالم، اے افتخارِ دوراں
اے وادیِ گُل افشاں!

وہ نقشِ ناز تُو ہے دنیائے رنگ و بُو میں
بے رنگ جس سے رونقِ حُسنِ فرنگ کی ہے
دنیا کے اہلِ ایماں کہتے ہیں جس کو جنّت
شرمندہ ہو کے تجھ سے روپوش ہو گئی ہے
ورنہ کہیں تو ہوتے آثارِ باغِ رضواں
اے وادیِ گُل افشاں!

کِس کو نصیب ہے یُوں اس زندگی میں جنت

جنّت کی زندگی ہے جینا فضا میں تیری

موجِ ہوا یہاں ہے رشکِ دمِ مسیحا

عُرفی نے سچ کہا تھا آب و ہوا میں تیری

مرغِ کباب آ کر ہو جائے مرغِ پرّاں[۱]

اے وادیِ گُل افشاں!

شاہوں کے قصر و ایواں اس کو ترس رہے ہیں

جو فیضِ حُسنِ فطرت ہے تیرے جھونپڑوں میں

تُو ریشمی دوشالے دنیا کو دے رہا ہے

تیرا جمالِ رنگیں رخشاں ہے چیتھڑوں میں

دورِ خزاں بھی تیرا ہے رشکِ صد بہاراں

اے وادیِ گُل افشاں!

دریا دلی سے اپنی قدرت نے تجھ کو بخشے

یہ چشمہ ہائے سیمیں، یہ آبشار تیرے

---

[۱] عرفی کا مشہور شعر ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر در آید — گر مرغِ کباب است کہ با بال و پر آید

جانِ بہار تیرے باغات اور جنگل

بھرپور سیم و زر سے یہ کوہسار تیرے

کیا تجھ کو احتیاجِ ظلِ ہوس پناہاں!

اے وادیٔ گل افشاں!

نذرِ ہوس پناہاں اب ہوں گے تیرے دشمن

عزمِ صمیم ہے یہ تیرے فدائیوں کا

اللہ کے کرم سے دن پھر چکے ہیں تیرے

تجھ کو صلہ ملے گا درد آشنائیوں کا

اس پر تلے ہوئے ہیں ہندو ہیں یا مسلماں

اے وادیٔ گل افشاں!

گزری مصیبتوں پر یہ کہہ کے مطمئن ہو

سرمایۂ سعادت ہے دردمند ہونا

آئے ہیں خاتمے پر ایامِ نامساعد

تقدیر میں تری ہے اب سربلند ہونا

دھو ڈال اپنے دل سے داغِ ملالِ حرماں

اے وادیٔ گل افشاں!

پیکرِ ایثار

جواہر لال نہرو

شَبابِ زندگی کو، زندگی کی ہر تمنا کو
جہانِ لُطفِ راحت کو، خیالِ عیشِ دنیا کو
امیری اور اس کے ذوقِ نیرنگِ تماشا کو
دل آرا شاہدانِ رنگ و بُو کے حُسنِ زیبا کو
وطن پر کر دیا قُرباں جواہر لال نہرو نے
کیا کتنا بڑا احساں جواہر لال نہرو نے

ثمر آخر ملا ہندوستاں کو اس ریاضت کا
کہ آخر خاتمہ ہو کر رہا دَورِ مصیبت کا
جنازہ ہند سے نکلا تشدّد کی حکومت کا
گئے اہلِ غرض ہر چند بو کر بیج نفرت کا
کیا اس بیج کو بے جاں جواہر لال نہرو نے
کیا کتنا بڑا احساں جواہر لال نہرو نے
ملی فرصت نہ اُس کو اک گھڑی آرام پانے کی
غلامی میں رہی اکثر صعوبت قید خانے کی
ہے آزادی میں دُھن اُجڑے وطن کو پھر بسانے کی
غرض ہر دَور میں ہر ذمّہ داری اک زمانے کی
اُٹھائی بارُخِ خنداں جواہر لال نہرو نے
کیا کتنا بڑا احساں جواہر لال نہرو نے!

جواہر لال

گرچہ اے ہم نشیں، وطن اپنا
سیم و زر سے نہیں ہے مالامال
غم نہیں ہے، کہ ہے یہاں موجود
گوہرِ بے بہا جواہر لال

ہم نے مانا کہ ہے ابھی دھندلا
مشرقِ آفتابِ جاہ و جلال
شکر کیا ہے، کہ جلوہ آرا ہے
نیّرِ خاوراں، جواہر لال

اس میں بھی شک نہیں کہ ہیں اب تک
ہم وطن بیشتر اسیرِ ملال
یہ بھی دیکھیں کہ ہے مسرت پاش
پیکرِ حریت، جواہر لال

سست رو گو ہے کارواں اپنا
ہے پرانی روش پہ اس کی چال
غم نہیں ہے کہ کارواں سالار
مل گیا ہے ہمیں جواہر لال

عاشقِ آرزوئے امن و اماں
آبروبخشِ عزم و استقلال
جانِ ایثار و پیروِ گاندھی
دولتِ ہند ہے، جواہر لال

مُبارک اے وطن تجھ کو

جواہر لال نہرو کی امریکہ اور یورپ سے واپسی پر

مُبارک اے وطن تجھ کو کہ نہرو کامگار آیا

وطن میں خیریت سے نازشِ شہر و دیار آیا

عزیزِ این و آں، جانِ وطن، فخرِ جہاں نہرو

خدا کا شکر باصد شوکت و عزّ و وقار آیا

دل و جاں سے زبانوں پر یہی آواز آتی ہے

دلوں کا تاجدار آیا، وطن کا جاں نثار آیا

ہوئی ہر خطہ میں عزت فزائی بارشِ گُل سے

جہاں پہنچا، صدا اُٹھی کہ پیغامِ بہار آیا

رہا خطرے میں جن سے امنِ عالم، امنِ عالم کا

اُنہی سے، شیر ایشیا کے عہدِ اُستوار آیا

"بنا دو خُلد اس اُجڑی ہوئی دنیا کو اے لوگو!"

فرشتہ امن کا اقصائے عالم میں پکار آیا

پیامِ امن جا کر مشرق و مغرب میں پہنچایا!

جو تھا ہندوستاں پر قرض گاندھی کا اُتار آیا

دیپ مالا کے چراغ

چراغ پھر ہوئے روشن جو دیپ مالا کے
فلک پہ رہ گئی بزمِ نجوم شرما کے

ازل کے نُور کا جلوہ ہے ان چراغوں میں
چراغِ طُور کا جلوہ ہے ان چراغوں میں

جھلک ہے عظمتِ ہندوستاں کی آج ان میں
چمک ہے روشنیٔ جاوداں کی آج ان میں

مرے خیال کا پرتو ہے ان کی طلعت میں
اُمّیدِ زندگیٔ نَو ہے اِن کی طلعت میں

فضائیں ہند کی ہیں آج پُربہار اِن سے
کہ ہوگئے ہیں در و بام لالہ زار اِن سے

نہ کیوں ہو جشنِ چراغاں کہ رام راج[1] آیا
تھی آرزو ہمیں جس کی، وہ روز آج آیا

---

[1] رام راج سے عدل و انصاف کی حکومت مراد ہے۔ نہ کہ کسی قوم یا فرقہ کی

دیپ مالا

کٹی ہے عمرِ غلامی میں ہم نوا میری
اگر رہا ہوں میں غمگیں تو کیا خطا میری
مرے کلام میں ہے رنج و غم کا گرا اظہار
صدائے قلبِ ستمدیدہ تھے مرے اشعار
وطن میں آئی مسرت کی جب کوئی تقریب
اضافہ کر گئی غم میں مرے وہی تقریب
چراغ گھر میں جلاتا تھا دیپ مالا پر
تو اُن کی لَو سے بھڑکتا تھا اور سوزِ جگر
ہُوا نہ دل سے کبھی مائل چراغاں میں
کہ یوں سخن میں دکھاتا تھا سوزِ پنہاں میں

نگاہِ[1] دیدۂ ظاہر میں گو چراغ ہیں یہ
چراغ ان کو نہ کہئے جگر کے داغ ہیں یہ

خدا کا شکر ہے، وہ دورِ ابتلا گزرا
ہمارے خون سے گو کھیلتا ہوا گزرا

خدا کا شکر کہ آزاد ہے وطن اپنا
ہوا کبھی تو بہار آشنا چمن اپنا

چراغ گھی کے جلائیں تو ہے بجا اب کے
ظہورِ شامِ دوالی ہے جاں فزا اب کے

چراغ اب کے بصد کرّ و فر جلائیں گے
مکاں نہیں تو سرِ رہ گزر جلائیں گے

●

[1] یہ شعر دیپ مالا کے عنوان سے لکھی ہوئی ایک پرانی نظم کا ہے۔ محروم

بیساکھی

زمیں کی شکل بدلی اور رنگِ آسماں بدلا
کہ فصلِ نَو کی ہے ہندوستاں میں جلوہ فرمائی
طلائی ہو گئے میداں زمرد پوش تھے جتنے
دلِ دہقاں میں امیدِ حیاتِ تازہ لہرائی
دلوں میں اس نے برپا کر دیے یادوں کے ہنگامے
بیساکھی آج اپنے ساتھ اک طوفان لے آئی
یہی تیوہار تھا، ڈائر نے جس دن جلیانوالے میں
سرِ اہلِ وطن پر گولیوں کی آگ برسائی
یہی دن تھا کہا تھا جب علی الاعلان گاندھی نے
کہ اب مہماں ہے یہ دورِ ستم رانی و خود رائی
جن آنکھوں نے درازی دستِ استعمار کی دیکھی
انہی آنکھوں نے استبداد کی دیکھی ہے پسپائی

گواکے ستم شعار

گھوڑوں پہ ہیں سوار ہوا کے ستم شعار
قائل نہیں ہیں روزِ جزا کے ستم شعار
کیا سامنے نہ ہوں گے خدا کے ستم شعار؟
ٹھہریں گے مستحق نہ سزا کے ستم شعار؟

دشمن ہیں گرچہ صدق و صفا کے ستم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے ستم شعار

چھپ چھپ کے جھاڑیوں سے طمنچے چلائیں جو
عورت کو آہ! جامِ شہادت پلائیں جو
گالی بغیر بات زباں پر نہ لائیں جو!
انسانیت کا اپنی جنازہ اُٹھائیں جو

ظالم غضب کے اور بلا کے ستم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے ستم شعار

کب تک رہیں گے خونِ شہیداں سے سرخُرو
سارا جہان اُن پہ کرے گا تفُو، تفُو

ہندوستان پر یہ حکومت کی آرزو
ہو کر ذلیل کھوئے گی مغرب کی آبرو
جائیں گے عزت اپنی گنوا کے سِتم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے سِتم شعار

غاصِب کو زیرِ چرخ ملی ہے اماں کبھی؟
کیا رُک گئی ہے گردشِ ہفت آسماں کبھی؟
آئے گا اِن کو راس نہ دَورِ زماں کبھی
مِٹ جائیں گے یہ دشمنِ امن و اماں کبھی
کب تک رکھیں گے خود کو چھپا کے سِتم شعار
کب تک سِتم کریں گے گوا کے سِتم شعار

برسائی ہیں انھوں نے نہتّوں پہ گولیاں
ڈائر کی طرح خود کو سمجھتے ہیں کامراں
لیتے ہیں اہلِ ہند کی غیرت کا امتحاں
اک آگ بھی ہے بحرِ اہنسا کے درمیاں
سن لیں یہ بات کان لگا کے سِتم شعار
کب تک سِتم کریں گے گوا کے سِتم شعار

صوبائی حدبندی

تخریب پسندوں کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر

کمیشن نے برپا ستم کر دیا — بڑھایا یہ صوبہ، وہ کم کر دیا
اُکھاڑے درختوں کے مانند شہر — انھیں دُور جا کر بسایا، یہ قہر
وہاں اب وہ برباد ہو جائیں گے — مکیں اُن کے ناشاد ہو جائیں گے
اُٹھو اور اُٹھ کر بغاوت کرو — حکومت کو مغلوبِ دہشت کرو
سکیمیں ترقی کی سب ہیں فضول — کریں گے ہم اُن کو نہ ہرگز قبول

ہم اپنے ہی صوبے بسائیں گے خود
وہیں اپنی قبریں بنائیں گے خود

سُرخ مینار

ریج روڈ، سبزی منڈی کے قریب ۔ انگریز کی فتح دہلی کی یادگار

یادگارِ محشرِ دہلی ہے یہ مینارِ سُرخ
یعنی دہلی پر یہیں سے آگ برسائی گئی
بڑھ گئی بھارت کی میعادِ غُلامی سو برس
پھر نئے سر سے اسے زنجیر پہنائی گئی

ثبت اس مینار کے پہلو میں اُن کے نام ہیں
جو ستمگر ڈھالنے والے تھے اس زنجیر کے
آخر اس بھٹی میں خود فی النار ہو کر رہ گئے
بس چلا اُن کا نہ کچھ بھی سامنے تقدیر کے

سر اٹھائے ہے پہاڑی پر کلیسا کی طرح
اور قرباں ہو رہی ہے سر پہ تقدیسِ صلیب
مدعا یہ ہے کہ عیسیٰ کی طرح معصوم تھے
ہند کی آئندہ صد سالہ غلامی کے نقیب

دیوِ استعمار کے کارندگانِ سنگدل
کوئی دیکھے تو ذرا، کیا کر گئے، کیا بھر گئے
قتل و غارت کو سمجھ کر زندگی کا مدعا
چھوڑ کر دہلی میں اپنے نام کے پتھر گئے

دیکھ کر ان یادگاروں کو دلِ اہلِ وطن
شمعِ آزادی کے پروانوں پہ ہے ماتم کُناں
وہ محبانِ وطن کرتا رہے گا جن کو پیش
ہدیۂ اشکِ عقیدت دیدۂ ہندوستاں

لکشمی بائی وہ جھانسی کی مہارانی، جسے
شیر کا دل، جسم عورت کا مُقدّر نے دیا
اُس شہیدِ حرّیت کو، حیف ہے، اے چرخِ دوں
تُو نے بعدِ قتل بخشی خار اور خس کی چِتا

ذِکر سے اس کے جگر پھٹتا ہے، کیوں کر ہو بیاں
جنگِ آزادی میں جو گزری بہادر شاہ پر
خوان لے کر آئے ہیں سفّاک اِک ڈھانپا ہوا
جب اُسے کھولا تو نکلے آہ! شہزادوں کے سر

تھے ہزاروں جاں فروشانِ وطن، اِک دو نہیں
کارنامے جن کے ہیں تزئینِ تاریخِ وطن
سینۂ دہلی پہ اس مینارِ سنگیں کا قیام
کچھ نہیں ہے اور جُز توہینِ تاریخِ وطن

بھومی دان

خیراتِ زمین

مانا کہ ہے اناج کی خیرات بھی بجا
کپڑے کا دان درخورِ اوقات بھی بجا
دنیا میں سیم و زر کی کرامات بھی بجا
لعل و گہر ہیں قیمتی، یہ بات بھی بجا
پھل پھول میں لطیف یہ سوغات بھی بجا
خیرات کے لئے ہیں فلزات بھی بجا
لیکن زمیں کے دان کی عظمت ہی اور ہے
بخشندۂ زمیں کی سعادت ہی اور ہے

ہر چند خاک ہے تہِ پائے بشر زمیں
لیکن ہے مہر و ماہ سے تابندہ تر زمیں

جانِ بہار، مادرِ گلہائے تر زمیں
آبستنیٔ جوہرِ لعل و گہر زمیں

اجناس اور کپاس سے ہے بارور زمیں
ہے کون حاملِ زر و سیم و ثمر، زمیں

سائل کو بخشتا ہے جو اپنی زمیں کوئی
اس سے بڑا ثواب جہاں میں نہیں کوئی

مُبارک انسان

گریں گی خرمنِ امن و اماں پر بجلیاں کب تک
کہ بادل فتنہ و شر کے سرِ عالم کڑکتے ہیں

زمیں ہے لرزہ بر اندام ایٹم بم کی ہیبت سے
زمیں کیا آسماں پر دل ستاروں کے دھڑکتے ہیں

ملایا خاک و خوں میں اُس نے لاکھوں نوجوانوں کو
ابھی تک دیوِ استبداد کے بازو پھڑکتے ہیں

یہی چرچا ہے دنیا میں، یہی سُننے میں آتا ہے
کہ شعلے آتشِ جنگ و جدل کے پھر بھڑکتے ہیں

مبارک ہیں وہ انساں، فخر ہیں وہ نوعِ انساں کے
جو ان شعلوں پہ صلح و امن کا پانی چھڑکتے ہیں

ماتمِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقالِ پُرملال پر

گاندھی کے بعد ہند میں مینارِ روشنی
تھی تیری ایک ذات جو طلعت فشاں رہی

جانے سے تیرے آہ! اندھیرا سا چھا گیا
آزاد! اب وہ نُور کی بارش کہاں رہی

ہاتھوں میں تھا ترے علَمِ اتحّادِ ملک
سائے میں جس کے قوم بہ امن و اماں رہی

توڑا طلسم جس نے فریبِ فرنگ کا
تیری رفاقت اُس کے لیے حرزِ جاں رہی

برسا کیا جو مینہ ترے فضل و کمال کا
شاخِ امیدِ اہلِ وطن گُل فشاں رہی

ہندوستاں کے مشرق و مغرب میں جابجا
وابستہ تجھ سے عظمتِ ہندوستاں رہی

نقشِ دوام بن گئی تحریرِ دل نشیں
تقریر تیری حاملِ حُسنِ بیاں رہی

خاک اُڑ رہی ہے آج کنگ ایڈورڈ روڈ پر
جو آب و تاب میں صفتِ کہکشاں رہی

ایامِ فصلِ گُل میں تو ہم سے جُدا ہوا
گویا بہار اب کے ہماری خزاں رہی

آزاد ہو کے بھی نہ ہوئے غم سے ہم رہا
اپنے لئے وہی رَوِشِ آسماں رہی

محروم ابتدا سے ہمارے نصیب میں
نوحہ گری وہی، وہی طرزِ فغاں رہی

قطعہ تاریخ

چوں رفت زدہرِ آں یگانہ — گنجورِ ادب، سیاست اُستاد
حیراں بُودم بہ فکرِ تاریخ — ہاتف زفلک چنیں ندا داد
گو با سرِ ہائے یازدہ بار — اے وائے اَبُوالکلام آزاد

۱۹۵۸ء = ۱۱ × (۵ + ۱۷۳)

رباعیات

کیا حادثہ، شدید پیش آیا ہے
جس نے اہلِ وطن کو تڑپایا ہے
ہے زلزلۂ عظیم آزاد کی موت
جس سے بھارت تمام تھرّایا ہے

گو قلبِ صمیم کا ہے حاملِ ہر دو
بے طور اُمنڈ آئے ہیں اُس کے آنسو
ہمدم، ہمراز، ہم سفر تھا اُس کا
آزاد گیا کہ اس کا دایاں بازو

اُردو کی بڑھائی جس سے تونے توقیر
کانوں میں ہے گونجتی ابھی وہ تقریر
اے آہ، ابوالکلام یہ خاموشی
اُردو کی سو گئی ہے گویا تقدیر!

قطعات

تقسیمِ وطن

اکتوبر ۱۹۴۷ء بمقام راولپنڈی

کچھ غم نہیں جو نام وطن کا بدل گیا
بدلا کوئی مقام، نہ راہیں بدل گئیں
صدیوں سے تھے جو ہمدم و ہمسایہ، ہم وطن
غم ہے تو یہ کہ اُن کی نگاہیں بدل گئیں!

ایضاً

کس درجہ ہو گئی ہے کٹھن منزلِ حیات
مشکل سے قطعِ راہ کئے جا رہا ہوں میں
خنجر چھپا ہوا نہ کسی آستیں میں ہو
ہر شخص پر نگاہ کئے جا رہا ہوں میں!

تعمیرِ ہند

سعیِ پیہم سے تری منزل پہ پہنچا کارواں
کانگرس! تیرا عَلَم ہے باعثِ توقیرِ ہند
تجھ سے وابستہ ہیں مستقبل کی اُمیدیں تمام
تیری مرہونِ عمل ماضی میں بھی تعمیرِ ہند

لارڈ مونٹ بیٹن کے دہلی سے جانے پر

سایہ فگن جو راہ نشینوں کے سر پہ تھے
طوفانِ ابر و باد میں وہ ٹاٹ بھی گئے
گھر گھاٹ، ٹاٹ کھاٹ کا محروم ذکر کیا
اس انقلاب میں تو بڑے لاٹ بھی گئے

وطن اور پاسدارِ وطن

جو داغ کھائے تھے دل پر وطن پرستوں نے
اسی سے ہو گئی ظاہر نئی بہارِ وطن
انہی کے فیض سے، اے دوست، خوں ہوئے جو دل
بہارِ تازہ دکھاتا ہے لالہ زارِ وطن
بہار اُن کو مبارک ہو سروریاں کی!
جو پاسدارِ وطن ہیں، جو ہیں نثارِ وطن

انقلاب

چشمِ مہر و ماہ نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
دورِ گردوں نے دکھایا ہے جو ہم کو انقلاب
جاں فزا جن کیلئے تھی جوششِ دریائے سندھ
ریگ زارِ راجپوتانہ میں ہیں وقفِ عذاب
ساحلِ جمنا کے نظاروں سے جن کو عشق تھا
سندھ کے صحراؤں میں ہیں وہ رہینِ اضطراب
مُہرِ خاموشی ہے اُن کے لب پہ چلاتے تھے جو
انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب

تقدیرِ ہند

ہاتھ میں مشعل اہنسا کی اُٹھا کر جائیں گے
مشرق و مغرب میں پھیلائیں گے ہم تنویرِ ہند
کوئی دن میں پھر چمکتا ہے ستارہ ہند کا
اے جہانِ تیرہ اب روشن ہوئی تقدیرِ ہند

نیا سال اور بارانِ رحمت

جہاں خاک اُڑتی تھی ہو گی وہاں سبزہ و گل کی اب جلوہ کاری نمایاں
نیا سال آتے ہی ساتھ اپنے لایا ہے بارانِ رحمت مبارک، مبارک
نئے سال کو دی سلامی جو توپوں سے ہندوستاں نے تو اوجِ فلک سے
گھٹا کی زباں میں گرج کر کہا سالِ نو نے یہ ساعت مبارک مبارک

پہلی بہار

غالب فضائے گُل پہ ابھی خارزار ہے
اُجڑے ہوئے چمن کی یہ پہلی بہار ہے
دلخواہ فصلِ گل بھی کبھی آ ہی جائے گی
مائل کرم پہ رحمتِ پروردگار ہے

مشورہ

یہ بھی مثلِ جاہلانِ خطۂ پنجاب کیوں
اپنے ہاتھوں، اپنے گھر کو وقفِ ویرانی کریں
دلّی والوں سے ہماری تو یہی ہے التجا
مشورہ آصفؔ[1] کا مانیں اور سلیمانی[2] کریں

---

[1] آصف علی مرحوم۔ سلیمان بادشاہ کے وزیر کا نام بھی آصف تھا
[2] یعنی بادشاہی کریں۔ مزے میں رہیں۔

مقامِ غور

(مہاتما گاندھی کے مرن برت پر)

اہلِ وطن! خدا کے لئے غور تو کرو
کیا کر رہے ہو دَورِ غلامی گزار کے
منزل پہ لے کے آیا ہے جو رہنما تمھیں
دم لوگے کیا تم اب اُسی محسن کو مار کے؟

تنبیہہ

مہاتما گاندھی کے آخری برت پر

دُنیا نے تسلیم کیا ہے سب سے بڑا انسان جسے
اپنے جینے سے پیاری ہے نوعِ بشر کی آن جسے
فیضِ ریاضت سے حاصل ہے ہستی کا عرفان جسے
جس کے عمل کا آئینہ ہے کہتے ہیں ایمان جسے
ہاتھ سے اپنے اُس کو گنوا کر آخر ہم کیا پائیں گے
ہاتھ ملیں گے، روئیں گے، شرمائیں گے، پچتائیں گے

مرن برت

اِتحادِ ہندو مُسلم کی خاطر، آج پھر
جان کی بازی لگا دی تو نے، اے جانِ وطن
دل دھڑکتے ہیں، پریشاں تر نہ ہو جائے کہیں
تیرے اس ایثار سے حالِ پریشانِ وطن

قتلِ گاندھی

آہ! کیا ہولناک شام ہے یہ — شورِ محشر بپا ہے دہلی میں
عمر بھر جو نثارِ ہند رہا — قتل وہ ہو گیا ہے دہلی میں

مہاتما جی کی شہادت پر

بہ وقتِ دُعا جانِ بزمِ وطن پر
وہ انساں نہیں جس نے حملہ کیا ہے
تشدّد کا تھا اب کہ بدخواہ گاندھی
تشدّد نے خود آ کے بدلہ لیا ہے

ایضاً

جان دے دی فرقہ داری کو مٹانے کے لئے
کاش پُوری آرزوئے دل ہو یہ مرکر تری
اتحادِ ملک کا حامی رہا تو عُمر بھر
کیوں نہ سنگم میں بہائی جائے خاکستر تری

مہاتماجی کے پھُول

شمیمِ اُنس، خوشبوئے وفا ہے تیرے پھُولوں میں
ترے دل کی طرح صدق و صفا ہے تیرے پھُولوں میں
ہوائے قُدس، جنّت کی فضا ہے تیرے پھولوں میں
بہارِ جاوداں، رنگِ بقا ہے تیرے پھُولوں میں
بسے گا عالمِ فانی ترے پھُولوں کی خوشبو سے
کہ شادابی ملی ہے ان کو اشکِ چشمِ نہرُو سے

مہاتما گاندھی

عالم تمام اُداس ہوا، تُو جو ہو گیا
اے امن و آشتی کے پیمبر، خموش آج
ہل چل سی ایک مشرق و مغرب میں ہے بپا
اقوام چُپکے چپکے ہیں پیکارکوش آج

مہاتما گاندھی کا مُعجزہ

اس میں کیا شک ہے کہ گاندھی تھا فقیرِ کامل
تھا وہ کلجگ میں بھی احکامِ خُدا کا عامِل
دیکھ لیں، کشف و کرامات کے ہیں جو قائل
ہند سے "رخصتِ انگریز" ہے سب کا حاصل
چل دیا ہند سے انگریز لڑائی کے بغیر
کیا یہ آسان تھا اعجاز نمائی کے بغیر

۲۶ جنوری

اِسی دن وہ صدا گونجی تھی راوی کے کنارے پر

دلِ دارائے انگریز کو دہلا دیا جس نے

یہی یومِ مبارک تھا شبِ تارِ غلامی میں

طلوعِ صبحِ آزادی کا مژدہ لا دیا جس نے

یہی چھبیسویں تاریخ ماہِ جنوری کی تھی

نشاں آزادیٔ کامل کی منزل کا دیا جس نے

سردار پٹیل کا عزمِ پنجاب

سردار نے پنجاب کا جس وقت کیا عزم

"جاتے ہیں کدھر؟" آپ سے اک شخص نے پوچھا

فرمایا کہ "جانا ہے مجھے جانبِ پنجاب

جلسہ ہے وہاں کانگرسی کارکنوں کا"

یوں اُس نے کہا "کون ہیں وہ کارکن آخر

ہے آپ کے دیدار کی اب جن کو تمنا

یہ ابتری ہرگز نہ دکھاتی اُسے تقدیر

پنجاب میں گر کارکُن انساں کوئی ہوتا"

پھر زندگی ملی

(سردار پٹیل کے ہوائی جہاز کا حادثہ)

جے پور سے خبر جو نہ آئی پٹیل کی

دہلی کا دل دھڑکنے لگا اضطراب سے

دم اس طرح فضاؤں کا گھٹ گھٹ کے رہ گیا

طاری ہو جیسے خوف کسی انقلاب سے

سر جھک گئے بہ شکر، کہ پھر زندگی ملی

سردارِ ذی ہمم کو خدا کی جناب سے

سالگرہ مبارک

(پنڈت جواہر لال نہرو کے جنم دن پر)

جنم دن تجھ کو مبارک اے جواہر لال ہو

حاملِ یُمن و سعادت، باعثِ اقبال ہو

مُلک و ملّت کے لئے یہ روز فرّخ فال ہو

تو بلند اقبال ہو، دشمن ترا پامال ہو

خوش بزی، تا دیر باش، اے جانِ جاناں شاد باش

شاد باش، اے یوسفِ کنعانِ جاناں شاد باش!

جواہر لال نہرو

نازاں نہیں ہے تجھ پہ فقط آبروئے ہند
قائم ہے تجھ سے جرأتِ احرارِ ایشیا
چشمِ اُمید کا ہے اشارہ کہ تُو ہے آج
نُورِ نگاہِ دیدۂ بیدارِ ایشیا

کشمیر میں طرفین کا مِلاپ

وقت آ ہی گیا رخصتِ ایامِ خزاں کا
گُل پوش ہوئی جاتی ہے پھر وادیِ کشمیر
اک دوسرے پہ کرتے تھے گولوں کی جو بارش
آپس میں بصد شوق ملے ہو کے بغل گیر!

انصاف

جواہر لال نہرو کے ایک اعلان پر

ہر اک ملّت کو ملّت سے، ہر اک کشور کو کشور سے
ہر اک انسان کو انسان سے انصاف لازم ہے
میں حیراں ہوں خموشی چھا گئی کیوں اہلِ محفل پر
کہا نہرو نے جب جاپان سے انصاف لازم ہے

لالہ لاجپت رائے کی برسی پر

کالا خود اپنا نامۂ اعمال کر لیا
دے دے کے جرمِ حبِّ وطن کی سزا تجھے
آخر وطن سے تیرے نکالی گئی وہ قوم
دو بار جس نے دیس نکالا دیا تجھے

بھگوان تلک کی یاد میں

اے رہبرِ ذی شان ترے اہلِ وطن آج

گلہائے عقیدت ترے قدموں پہ چڑھاتے

صیاد ہے اب اپنے چمن میں نہ ہے گلچیں

مرغانِ چمن پھرتے ہیں آزادی سے گاتے

ہر شخص ہے دل شاد کہ آزاد ہے بھارت

ہم گیت ترے شکریہ کے تجھ کو سناتے

افسوس کہ تُو وقت سے پہلے ہوا راہی

بھگوان تلک ہم تری برسی ہیں مناتے!

لالہ لاجپت رائے کی یاد میں

ہمیں جس حال میں رکھے مقدر جس طرح چاہے
زمیں فتنے اُٹھائے، آسماں نیرنگ دکھلائے
نہ بھولے ہیں، نہ بھولیں گے کبھی ہم روزِ محشر تک
محبّانِ وطن کو، رزمِ قومی میں جو کام آئے
شہیدانِ وفا پرور مقیمِ خلوتِ دل میں
مقامِ برتریں پر ہے انہی میں لاجپت رائے!

ایضاً

موہوم تھی آزادیِ ابنائے وطن جب
جب قوم تھی پابستۂ زنجیرِ غلامی
اے لاجپت، اے فخرِ وطن، نازشِ ملّت
تھی آبروئے قوم تری ذاتِ گرامی

گوا کی پولٹیکل کانفرنس کا فیصلہ

ڈیرہ اٹھاؤ ہند سے اے پُرتگالیو
گنجائش اب نہیں ہے کسی قیل وقال کی
ہالینڈ کو گیا کوئی انگلینڈ کو گیا
اب راہ تم بھی خیر سے لو پُرتگال کی!

ہندوستان اور جنوبی افریقہ

جب اک جماعتِ عزّت نشاں کے ممبر ہیں
نٹال میں نہ ملے کیوں برابری ہم کو
زباں پہ حرفِ وفا اور آستیں میں چھری
کبھی نہ بھائے گی ایسی برادری ہم کو

امتیازِ رنگ

چہرہ جو ہے سفید تو کیا، دل سیاہ ہے
بیہودگی سے کم نہیں گورے کا نازِ رنگ
قائم نہ رہ سکے گی حکومت ملان کی!
اک روز رنگ لائے گا یہ امتیازِ رنگ

ہند اور ایران کا معاہدۂ دوستی

تضمین

سُنا ہے کہ ایران اور ہند میں ہے تجویز اُلفت کے پیمان کی
یقیناً یہ ہے مژدۂ جانفزا نہیں جھوٹ کہتے ہیں ایمان کی
اسی پر ہمارا بھی ہے اعتقاد یہ تعلیم ہے شیخ ایران کی
"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند"

فرقہ واری

ہند میں جس کو نہیں منظور جمہوری نظام
ہند سے کیا اُس کو مطلب ہند سے کیا اُس کو کام
خواہ ہندو، خواہ مُسلم ہو تعصّب کا غلام
ڈھونڈ لے وہ ہند سے باہر کہیں جا کر مقام
فرقہ واری سے ہے بالاتر ہماری سرزمیں
تنگ ہوگی فرقہ واروں پر ہماری سرزمیں

جشنِ جمہوریت اور فرقہ دار لیڈر

نظر آتی ہے فرقہ واری میں — ایک لیڈر کو اپنی سرداری
اہلِ بینش پہ ہے مگر روشن — فرقہ واری کا زہر ہے کاری
فرقہ واری سے جو ملا ہم کو — آج تک اُس پہ اشک ہیں جاری
دشمنیِ مادرِ وطن سے ہے
جشنِ جمہوریت سے بیزاری

فرقہ پرستی

اب ہم پہ کرم چاہیئے اے فرقہ پرستی
کر بیٹھے ہیں تیرے لیئے لاکھوں کا صفایا
جا، اور کہیں جا، تری خاطر، ترے ہاتھوں
گاندھی سا ہادی ترے ہاتھ سے خود ہم نے گنوایا

ہڑتال

عہدِ انگریز میں ہڑتال کا مقصد یہ تھا
کہ ہو برہم کسی حیلے سے حکومت کا نظام
اب کہ اپنا ہے نظام اور حکومت اپنی
کس لیئے اہلِ وطن لیتے ہیں ہڑتال سے کام
وقتِ تعمیر ہے، تخریب کا وہ دور گیا
اب تو ہڑتال کے بدلے ہو تعاون کا پیام

قطعہ

بعض رُوپ دھاری محبانِ وطن کی خود غرضی کو دیکھ کر

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو کسے اے ہمنوا
جب نہ ہو شاخِ چمن سے گلفشانی کی اُمید
وائے قسمت، ہو گئے صیّاد اور گلچیں وہی
جن سے تھی اہلِ چمن کو باغبانی کی اُمید

ابُوالکلام آزاد

بادِ سموم جس پہ اثر کچھ نہ کر سکی
اُس نخلِ پُر بہار کے سائے میں کیوں نہ آئیں
اسلامیانِ ہند کو کہتے ہیں جو غلام
وہ اپنی مملکت میں اک آزاد تو دکھائیں

مشرق کی بیداری

ہوئی باطل شکن لمحات میں مشرق کی بیداری
چلے گی ساحرِ افرنگ کی اب کیا فسوں کاری
شبِ غفلت گئی، جب خواب تھی آزادیٔ مشرق
ہے اب خوابِ کہن مشرق پہ مغرب کی عملداری
پیامِ امن پھر روحانیت کی سرزمیں دے گی
رہے گی اب نہ زیرِ آسماں رسمِ ستمگاری
جو پہنچائے گی پیغامِ وفا اقصائے عالم میں
کرے گا اِس مہم کی ایشیا دہلی میں تیاری